۶۸۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۲۰۴-۲۱۴

اوپر حج کے بیان کے سلسلے میں آخر میں یہ بات جو آگئی تھی کہ بعض لوگ حج کو صرف اپنی دنیوی تمنا برآریوں ہی کا ذریعہ بناتے ہیں، آخرت کی طلب سے ان کے سینے بالکل خالی ہوتے ہیں، وہیں سے کلام منافقین کے ذکر کی طرف مڑ گیا۔ اس لیے کہ جو لوگ اتنے دنیا طلب ہوں کہ حج کی دعاؤں میں بھی اپنی دنیا ہی بنانے کی کوشش کریں وہ منافق ہی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ذکر کی مناسبت سے چند آیتوں میں منافقین کے کردار پر تبصرہ بھی ہو گیا اور ساتھ ہی پکے اہل ایمان کا جو کردار ہونا چاہیے اس کا ذکر بھی آ گیا اور ان کو بعض مناسب موقع ضروری تنبیہات بھی کر دی گئیں تاکہ منافقوں کی منافقانہ روش ان کے لیے کسی ٹھوکر کا باعث نہ بنے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۰۴-۲۱۴

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾ ع ۲۵

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰھُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ

نِعۡمَةَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾
زُيِّنَ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا وَيَسۡخَرُوۡنَ مِنَ الَّذِيۡنَ
اٰمَنُوۡا ۘ وَالَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا فَوۡقَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرۡزُقُ مَنۡ (وقف لازم)
يَّشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ
اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ ۪ وَاَنۡزَلَ مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ
لِيَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ فِيۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ ؕ وَمَا اخۡتَلَفَ فِيۡهِ
اِلَّا الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡهُ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ بَغۡيًاۢ بَيۡنَهُمۡ ۚ
فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَا اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ مِنَ الۡحَقِّ بِاِذۡنِهٖ ؕ
وَاللّٰهُ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۲۱۳﴾ اَمۡ حَسِبۡتُمۡ
اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَـنَّةَ وَلَمَّا يَاۡتِكُمۡ مَّثَلُ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ
قَبۡلِكُمۡ ؕ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰى يَقُوۡلَ
الرَّسُوۡلُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ
قَرِيۡبٌ ﴿۲۱۴﴾

ترجمۂ آیات ۲۰۴-۲۱۴

اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جن کی باتیں تو اس دنیا کی زندگی میں تمہیں بڑی میٹھی
معلوم ہوتی ہیں اور وہ اپنی دلی نیت پر خدا کو گواہ بھی بناتے ہیں لیکن ہیں وہ کٹر دشمن۔
اور جب وہ تمہارے پاس سے ہٹتے ہیں تو ان کی ساری بھاگ دوڑ اس لیے ہوتی ہے کہ
زمین میں فساد مچائیں اور کھیتی اور نسل کو تباہ کریں اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ اور جب
ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کا خوف کرو تو گھمنڈ ان کو گناہ پر آمادہ کرتا ہے۔ سو ایسوں کے

لیے جہنم کافی ہے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی رضاجوئی کے لیے اپنے آپ کو تج دیتے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے۔ ۲۰۷

اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ وہ تمھارا کھلا ہُوا دشمن ہے۔ اگر تم ان کھلی ہوئی تنبیہات کے بعد بھی جو تمھارے پاس آچکی ہیں، پھسل گئے تو جان رکھو کہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ ۲۰۸، ۲۰۹

اب تو یہ لوگ صرف اسی بات کے منتظر ہیں کہ اللہ نمودار ہو جائے بدلیوں کے سایہ میں اور اس کے فرشتے اور معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے۔ یہ امور اللہ ہی کے حوالے ہیں۔ بنی اسرائیل سے پوچھو، ہم نے ان کو کتنی کھلی کھلی نشانیاں دیں۔ اور جو اللہ کی نعمت کو، اس کے پانے کے بعد، بدل ڈالے تو اللہ سخت پاداش والا ہے۔ ان کافروں کی نگاہوں میں دنیا کی زندگی کھبا دی گئی ہے اور یہ اہل ایمان کا مذاق اڑا رہے ہیں حالانکہ جو لوگ تقویٰ اختیار کیے ہوئے ہیں، قیامت کے دن، وہ ان پر بالا ہوں گے۔ اور اللہ جسے چاہے بے حساب روزی دے۔ ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲

لوگ ایک ہی امّت بنائے گئے انھوں نے اختلاف پیدا کیا تو اللہ نے اپنے انبیاء بھیجے جو خوشخبری سناتے اور خبردار کرتے ہوئے آئے اور ان کے ساتھ کتاب بھیجی قولِ فیصل کے ساتھ تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں، ان میں فیصلہ کر دے۔ اور اس میں اختلاف نہیں کیا مگر ان ہی لوگوں نے جن کو یہ دی گئی تھی، بعد اس کے کہ ان کے پاس کھلی کھلی ہدایات آچکی تھیں، محض باہمی ضدم ضدا کے سبب سے۔ پس اللہ نے اپنی توفیق بخشی سے

اہل ایمان کی اس حق کے معاملے میں رہنمائی فرمائی جس میں لوگوں نے اختلاف کیا۔ اللہ جس کو چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی ہدایت دیتا ہے۔ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہیں ان حالات سے سابقہ پیش نہیں آیا جن سے تمہارے اگلوں کو پیش آیا، ان کو آفتیں اور مصیبتیں پہنچیں اور وہ اس قدر جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے پکار اٹھتے ہیں کہ اللہ کی مدد کب نمودار ہوگی! بشارت ہو کہ اللہ کی مدد قریب ہے! ۲۱۳-۲۱۴

۶۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ (۲۰۴)

منافقین کردار کے کمزور اور گفتار کے غازی ہوتے ہیں

یہ اشارہ ہے منافقین کی طرف۔ جن لوگوں کے کردار کمزور ہوتے ہیں، عموماً وہ گفتار کے بڑے غازی ہوتے ہیں، یہ اپنی عملی کمزوریوں پر اپنی چرب زبانی اور خوش گفتاری سے پردے ڈالنے اور مخاطب کی نیک نیتی اور کریم النفسی سے فائدہ اٹھا کر اس کو اپنے طرزِ عمل کے بارے میں مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مدینہ کے منافقین میں بھی ایک گروہ ایسے لوگوں کا تھا۔ یہ لوگ کھاتے پیتے، سہل پسند، تن آسان اور چرب زبان تھے، شکلیں اچھی، لباس صاف ستھرے، مجلسی آداب میں مشاق لیکن دل کے بودے اور عمل کے چور تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اسلام کی حمایت میں آسمان و زمین کے قلابے ملاتے لیکن جب وہاں سے ہٹتے تو ان کی ساری بھاگ دوڑ اسلام کی مخالفت کی راہ میں ہوتی۔ انھی لوگوں کی تصویر سورۂ منافقون میں ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ
وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ
كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ يَحْسَبُوْنَ
كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ هُمُ
الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ قَاتَلَهُمُ

اور جب تم ان کو دیکھتے ہو تو ان کی شکلیں تمھیں اچھی لگتی
ہیں اور اگر وہ بات کرتے ہیں تو ان کی چرب زبانی کی وجہ
سے تم ان کی بات سنتے ہو، لیکن حقیقت میں یہ لکڑی کے
کندوں کے مانند ہیں جن کو ٹیک لگا دی گئی ہو، وہ ہر خطرے
کو اپنے ہی اوپر سمجھتے ہیں، اصلی دشمن یہی ہیں، پس ان سے

اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۴)	بچ کر رہو۔ اللہ انہیں ہلاک کرے، یہ کس طرح اوندھے ہوئے جاتے ہیں۔

یعنی ان کے پلے ہوئے جسم اور پالش کی ہوئی شکلیں بظاہر دل کو بھاتی ہیں اور ان کی چکنی چپڑی باتیں جو یہ تمھیں خوش کرنے کے لیے کرتے ہیں، حمایت اسلام کے جوش میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں اس وجہ سے تمھیں دل کش معلوم ہوتی ہیں اور تم ان کی یہ باتیں سنتے ہو، لیکن حقیقت میں یہ اندر سے بالکل کھوکھلے ہیں۔ ان کے سینوں میں نہ دل ہیں، نہ ایمان نہ اسلام۔ یہ بالکل لکڑی کے کھوکھلے کندوں کے مانند ہیں جن کو گویا لباس پہنا کر دیواروں سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا گیا ہے۔ دولتِ ایمان سے محروم ہونے کے سبب سے یہ انتہا درجہ کے بزدل ہیں اس وجہ سے یہ ہر خطرے کو اپنے ہی اوپر آتا دیکھتے ہیں اور اپنی اس بزدلی کو اپنی چکنی چپڑی باتوں کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تمھاری توجہ ہٹانے کے لیے تو دوسروں کی طرف انگلی اٹھاتے ہیں کہ وہ اسلام کے لیے خطرہ ہیں لیکن اسلام کے لیے حقیقی خطرہ خود ان کے نفاق اور ان کی بزدلی کی طرف سے ہے اس وجہ سے ان کی طرف سے پوری طرح ہوشیار رہو۔

بعینہٖ یہی بات اس زیر بحث آیت میں فرمائی گئی ہے کہ جہاں تک ان کی باتوں کا تعلق ہے یہ دل کو بڑی موہ لینے والی ہوتی ہیں لیکن یہ ساری باتیں ملمع کی ہوئی ہیں اور اس ملمع کی یہ مصنوعی آب و تاب چند روزہ ہے۔ اس دنیا میں بے شک وہ ان جھوٹے موتیوں سے لوگوں کو جُل دینے کی کوشش کر سکتے ہیں لیکن عنقریب وہ دن آنے والا ہے جب جھوٹے اور سچے اور کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہو جائے گا اور ان کے چہرے کی یہ پرفریب نقاب اتر جائے گی۔

وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىْ قَلْبِهٖ (اور وہ اپنے دل کی نیت پر خدا کو گواہ ٹھہراتا ہے) خدا کو گواہ ٹھہرانے کے معنی خدا کی قسم کھانے کے ہیں۔ منافق کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو معتبر ثابت کرنے کے لیے بات بات پر قسم کھاتا ہے۔ اس کے پاس چونکہ کردار کی حجت نہیں ہوتی اس وجہ سے ہر قدم پر قسم کو بطور دلیل پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے، جھوٹا آدمی، اپنی نفسیاتی کمزوری کی وجہ سے، سمجھتا ہے کہ مخاطب اس کی بات اس وقت تک باور نہیں کرے گا جب تک وہ اس کو قسم کھا کر یقین نہ دلائے۔ ایک راستباز اور صاحب کردار اپنے عمل پر اعتماد کرتا ہے اور جب اس پر کوئی گرفت ہوتی ہے تو وہ اپنے عمل ہی کی دلیل سے اس کی مدافعت کرتا ہے لیکن ایک منافق کے پاس چونکہ عمل کا سہارا نہیں ہوتا اس وجہ سے جب اس پر کوئی گرفت ہوتی ہے تو وہ قسم کو اپنی ڈھال بناتا ہے اور اسی کے سہارے لوگوں کی گرفت سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ سورۂ منافقون میں منافقین کے اس کردار کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ	جب تمھارے پاس منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں

إِنَّكَ لَرَسُولُهُ ۚ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ ۝ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱-۲ منافقون)

اللہ خوب جانتا ہے کہ بے شک آپ اس کے رسول ہیں، لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ بے شک یہ منافق بالکل جھوٹے ہیں۔ انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور اس طرح وہ اللہ کے راستہ سے رک گئے ہیں بہت ہی بری ہے وہ حرکت جو یہ کر رہے ہیں۔

وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ، خصام خصم کی جمع ہے اور اَلَدّ کے معنی شدید الخصومۃ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بظاہر تو ان کی باتیں تمھارے سامنے بڑی چکنی چپڑی ہوتی ہیں لیکن ان کے دلوں کے اندر تمھارے اور اسلام کے خلاف نہایت شدید قسم کا بغض و حسد بھرا ہوا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف سورہ منافقون میں هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ (اصل دشمن وہی ہیں، ان سے بچ کے رہو) کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔

وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (۲۰۵)

اسلام کی مخالفت فساد فی الارض ہے

یعنی تمھارے سامنے تو ان کی باتیں بڑی دل لبھانے والی ہوتی ہیں لیکن تمھارے پاس سے ہٹنے کے بعد ان کی ساری بھاگ دوڑ فساد فی الارض کی راہ میں ہوتی ہے۔ فساد فی الارض سے مراد، جیسا کہ ہم آیت ۱۱ کے تحت واضح کر چکے ہیں، اللہ کی بندگی اور اطاعت کی اس دعوت کی مزاحمت و مخالفت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے۔ زمین کے تمام امن و عدل کا انحصار اس بات پر ہے کہ اللہ کے بندے اللہ ہی کی بندگی اور اسی کی اطاعت میں داخل ہو جائیں، جیسا کہ آگے ارشاد ہو رہا ہے۔ اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ (اللہ کی اطاعت میں سب کے سب داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو) اس بندگی و اطاعت میں داخل ہو جانے کے بعد شیطان کے لیے در اندازیوں اور فساد کی تمام راہیں بند ہو جاتی ہیں۔ بصورتِ دیگر تمام نسلِ انسانی شیطان کی فساد انگیزیوں کی آماجگاہ بنی رہتی ہے اور وہ برابر بغض و عداوت کی آگ بھڑکاتا رہتا ہے جو حرث و نسل دونوں کی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ اہل عرب نے اسلام سے پہلے دورِ جاہلیت میں اس صورت حال کا اچھی طرح تجربہ کر لیا تھا اس وجہ سے ان کے لیے یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہ تھا کہ تباہی کے اس جہنم سے خلقِ خدا کو نکالنے کے لیے سلم و اطاعت کی وہ دعوت کتنی بڑی رحمت و برکت تھی جو قرآن نے پیش کی تھی اور پھر انسانیت کے کتنے بڑے دشمن تھے وہ لوگ جو اس دعوت کی مخالفت کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ دنیا اسی جہنم میں پڑی جلتی رہے۔

"وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ" یعنی بظاہر وہ کتنی ہی چکنی چپڑی باتیں کیوں نہ کریں اور اسلام اور پیغمبر کی دوستی کا دم کیوں نہ بھریں لیکن وہ اللہ کی نظروں میں کوئی مقام کس طرح حاصل کر سکتے ہیں جب وہ اپنے طرزِ عمل سے اس فساد کو ہوا دے رہے ہیں جس کے نتیجہ میں تمام انسانیت کی تباہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب یہ دنیا بنائی ہے تو وہ اس کی فلاح و بہبود کو پسند کرتا ہے، اس میں فساد اور مفسدین کو وہ پسند نہیں کرتا۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ (۲۰۶)

دینداری کے جھوٹے دعویداروں کا غرور

اسلام دوستی اور دینداری کے ایسے جھوٹے دعویداروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جب ان کی کسی خلاف اسلام حرکت پر گرفت کی جائے اور ان کی توبہ اور اصلاح کی طرف توجہ دلائی جائے تو ان کے پندار کو بڑی چوٹ لگتی ہے۔ وہ اپنی کمزوری و بے اعتمادی اور احساس کہتری کی وجہ سے سمجھتے ہیں کہ اگر ایک مرتبہ انھوں نے اپنی کمزوری تسلیم کرلی تو ان کا سارا بھرم ختم ہو جائے گا، اس وجہ سے وہ اپنی اکڑ میں کوئی خم نہیں پیدا ہونے دیتے۔ منافقین کے اس خاص پہلو کی طرف سورۂ منافقون میں ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِينَ (۵-۶)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ توبہ کرو، اللہ کا رسول بھی تمہارے لیے خدا سے مغفرت مانگے گا تو وہ اپنی گردن موڑ لیتے ہیں اور تم ان کو دیکھو گے کہ وہ استکبار کے ساتھ اعراض کرتے ہیں۔ ان کے لیے یکساں ہے تم ان کے لیے مغفرت مانگو یا نہ مانگو۔ اللہ ان کو معاف کرنے والا نہیں ہے۔ اللہ بدعہدوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔

اسی حقیقت کی طرف سورہ نساء کی یہ آیتیں بھی اشارہ کر رہی ہیں۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلٰى مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنٰفِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا أُولٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اپنے معاملات کے فیصلے کے لیے اللہ کی اتاری ہوئی چیز اور رسول کی طرف آؤ تو تم منافقین کو دیکھتے ہو کہ وہ تم سے بڑی بے پروائی سے گریز کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت کیا ہوگا جب ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو کوئی مصیبت پہنچے گی، پھر یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آئیں گے کہ، خدا کی قسم ہم نے تو یہ محض خیر خواہی اور سازگاری پیدا کرنے کے جذبے کے تحت کیا! اللہ ان کے دلوں کی بات کو خوب جانتا ہے تو ان سے اعراض کرو اور ان کو نصیحت کرو اور ان کو خود ان کے معاد میں دلنشین بات کہو۔ اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے اور اگر وہ اس وقت جب کہ انھوں نے اپنے اوپر

فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (۶۱-۶۴- نساء)

ظلم کیا، تمھارے پاس آتے، پھر اللہ سے مغفرت مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے مغفرت مانگتا تو وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔

فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ (پس اس کے لیے جہنم ہی کافی ہے) یہ ٹکڑا بالعموم اس موقع پر آیا ہے جہاں یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ جن کو دنیا میں ان سنگین شرارتوں کے باوجود ڈھیل دی جاتی ہے تو یہ ڈھیل ان کے لیے کوئی رعایت نہیں ہے بلکہ یہ صرف اس لیے دی جاتی ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے آگے جو جہنم تیار ہے وہ ساری کسر پوری کر دینے والی ہے، اس کے ہوتے ان کے لیے اس دنیا میں کسی عذاب کی ضرورت نہیں ہے۔ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ (۲۰۷)

اہلِ اخلاص کی حوصلہ افزائی

شری یشری کے معنی بیچنے کے ہیں۔ یہ اشارہ ہے مخلص اہلِ ایمان کی طرف جنھوں نے اللہ کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لیے اپنا سب کچھ تج دیا ہے۔ ان کا ذکر یہاں دو پہلوؤں سے ہے۔ ایک یہ کہ ان منافقین کو غیرت آئے جن کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا ہے کہ سب تمھارے ہی جیسے مفاد پرست اور ابن الوقت نہیں ہیں بلکہ تمھارے ہی آنکھوں کے سامنے اللہ کے وہ بندے بھی ہیں جو اپنا تن، من، دھن سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کرنے کا عہد کر چکے ہیں اور اپنی زندگی کا مقصد اس کی رضا کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔ دوسرا یہ کہ اس ذکر سے ان اہلِ ایمان کی حوصلہ افزائی ہو جو ان منافقین کے برعکس اللہ ہی کے لیے جینے اور اللہ ہی کے لیے مرنے والے تھے۔ منافقین کے ذکر کے پہلو بہ پہلو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف اشارہ کر کے یہ ظاہر فرما دیا کہ اس کے جانباز و وفادار بندے بھی موجود ہیں اور وہی اس کی رافت و رحمت کے سزاوار ہیں۔

"وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ" میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر چند اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیع و شرا کا عہد بڑا کٹھن ہے اور اللہ کی رضا جوئی کے لیے اپنی ساری زندگی کو تج دینا ایک عظیم جہاد ہے جس کے تقاضے بڑے صبر آزما ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے، وہ ان پر ان کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا، اور اگر اس عہد کے تقاضوں میں ان سے کوئی بھول چوک ہو جاتی ہے تو اس کو معاف کرتا ہے، لغزشوں اور کوتاہیوں کے لیے اس نے توبہ و اصلاح کی راہیں کھلی رکھی ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۲۰۸)

'سلم' کا مفہوم

سِلْم کے معنی اطاعت کے ہیں اور مراد اس سے اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی اسلام کے لیے ہیں۔ لیکن یہ فرق محض ظاہر کا فرق ہے، اس لیے کہ اسلام کی اصل حقیقت اللہ و رسول کی اطاعت ہی ہے۔ یہ لفظ حرب کا ضد بھی آتا ہے اس صورت میں اس کے معنی صلح و امن کے ہوتے ہیں، اس

مفہوم میں بھی اسلام کی روح موجود ہے۔ اس لیے کہ صلح و امن کی اصل راہ اللہ و رسول کی اطاعت ہی ہے۔

'کافّۃ' کا مفہوم

'کافّۃ' کے معنی جماعت کے ہیں اور یہ یہاں حال پڑا ہوا ہے۔ قرآن میں دوسرے مقامات میں بھی یہ اسی شکل میں استعمال ہوا ہے۔

منافقین کو مخلصانہ اطاعت کی دعوت

خطاب اگرچہ الفاظ کے لحاظ سے عام یعنی تمام مسلمانوں سے ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ روئے سخن ان منافقین کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا ہے۔ ان سے خطاب کر کے یہ کہا جا رہا ہے کہ سچے اور پکے اہل ایمان کی طرح تم بھی اللہ و رسول کی اطاعت میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ اس ہدایت کی وجہ یہ ہے کہ ان منافقین کی وفاداری تقسیم تھی۔ یہ ایک طرف تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے مدعی تھے اور اسلام کی حمایت کا دم بھرتے تھے اور دوسری طرف اسلام کے مخالفین کے ساتھ بھی ان کا سازباز تھا۔ قرآن نے جگہ جگہ ان کی اس روش کی طرف اشارے کیے ہیں۔ مثلاً سورۂ محمد میں انھیں لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ (۲۶- محمد)

یہ اس وجہ سے ہے کہ ان منافقین نے ان لوگوں سے جنھوں نے اللہ کی اتاری ہوئی چیز کا برا منایا، یہ کہا کہ ہم بعض معاملات میں آپ ہی لوگوں کی اطاعت کریں گے اللہ ان کی اس رازداری کو خوب جانتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں 'لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا' سے اشارہ یہود اور مشرکین کے لیڈروں ہی کی طرف ہو سکتا ہے۔ سورۂ نساء کی مندرجہ ذیل آیات بھی ان کی اسی روش کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۝ (۶۰-۶۱ نساء)

ذرا ان لوگوں کو دیکھو جو مدعی ہیں کہ وہ اس چیز پر بھی ایمان لائے ہیں جو تم پر اتری ہے اور اس چیز پر بھی جو تم سے پہلے اتری ہے، یہ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات فیصلے کے لیے طاغوت کے پاس لے جائیں حالانکہ ان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اس کا انکار کریں۔ شیطان چاہتا ہے کہ ان کو بڑی ہی دور کی گمراہی میں پھینک دے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کی طرف آؤ جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی طرف تو تم ان منافقین کو دیکھتے ہو کہ وہ طرح طرح سے گریز کی راہیں اختیار کرتے ہیں۔

یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ یہاں طاغوت سے مراد یہود کی عدالتیں ہیں۔ چونکہ ان عدالتوں سے رشوت وغیرہ دے کر خلافِ عدل و انصاف فیصلے کرانا بڑی آسانی سے ممکن تھا، نیز علمائے یہود نے اپنی کتر بیونت سے

شریعت کے بہت سے احکام اپنی خواہشات کے مطابق کر دیے تھے اس وجہ سے منافقین اپنے بہت سے معاملات انھی کی عدالتوں میں لے جانا چاہتے تھے اور جب ان سے کہا جاتا کہ ایمان و اسلام کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ اپنے معاملات قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کریں تو وہ مختلف حیلوں حوالوں سے گریز اختیار کرنے کی کوشش کرتے۔

منقسم وفاداری شرک ہے

وفاداری کی یہ تقسیم ایمان و اسلام کے منافی بلکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے شرک ہے۔ یہیں سے شیطانوں کو انسانوں کو گمراہ کرنے کی، جیسا کہ سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں اشارہ ہے، نہایت کشادہ راہ مل جاتی ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے اس فتنہ کے دروازے کو بند کرنے کی ہدایت کی اور حکم دیا کہ سب کے سب بغیر کسی استثناء اور بغیر کسی تحفظ کے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں داخل ہو جائیں۔ اطاعتِ کامل کا یہی راستہ امن و عدل کا راستہ ہے اور اسی راستہ پر چلنے والوں کے لیے فوز و فلاح ہے۔ جو لوگ اس سے ہٹ کر کوئی راہ نکالنی چاہتے ہیں اور بیک وقت کفر اور اسلام دونوں سے رسم و راہ رکھنے کے خواہشمند ہیں، وہ شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی کر رہے ہیں اور شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے اس لیے کہ اس نے روزِ اول ہی سے اس کی راہ مارنے اور اس کو گمراہ کرنے کا کھلم کھلا الٹی میٹم دے رکھا ہے۔

فَإِن زَلَلْتُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمُ الْبَيِّنَاتُ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۲۰۹)

'بینات' سے مراد

'بیّنات' سے مراد وہ تنبیہات و تہدیدات بھی ہیں جو شیطان کی چالوں اور اس کے فتنوں سے آگاہ کرنے کے لیے نہایت تفصیل کے ساتھ قرآن میں بیان ہوئی ہیں اور وہ واضح اور قطعی ہدایات بھی جو ایمان و اسلام کے تقاضوں کو بیان کرنے کے لیے وارد ہوئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر سورج کی طرح روشن ہدایات و تنبیہات کے بعد بھی تم نے (خطاب منافقین ہی سے ہے) اپنے ازلی اور کھلے ہوئے دشمن ہی کے نقشِ قدم کی پیروی کی تو اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ خدا کی پکڑ سے تم کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ خدا عزیز و حکیم ہے۔

'عزیز' اور 'حکیم' کی وضاحت

'عزیز' کی صفت کے حوالہ سے دو حقیقتوں کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ ایک تو اس حقیقت کی طرف کہ خدا کوئی کمزور و ناتواں ہستی نہیں ہے بلکہ وہ غالب و توانا ہے تو جو اس کی تنبیہات کے باوجود شیطان کی پیروی کریں گے ان کو وہ اس عذاب میں ضرور پکڑے گا جو شیطان کے پیرؤوں کے لیے اس نے مقدر کر رکھا ہے اور جس کی اس نے پہلے سے خبر دے رکھی ہے۔ دوسرا اس طرف کہ جو لوگ ان واضح ہدایات کے بعد بھی راہِ حق کو چھوڑ کر شیطان ہی کی پیروی اختیار کریں گے وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑیں گے بلکہ اپنا ہی بگاڑیں گے اس لیے کہ خدا عزیز ہے یعنی ہر نفع و نقصان سے بالاتر۔

اسی طرح حکیم کی صفت بھی یہاں دو حقیقتوں کو نمایاں کر رہی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس دنیا کا خالق حکیم ہے اور اس کے حکیم ہونے کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ وہ اپنی ہدایت پر جمے رہنے والوں اور اس سے منحرف ہو جانے والوں کے درمیان ان کے انجام کے لحاظ سے امتیاز کرے، اگر وہ ان میں کوئی امتیاز نہ کرے بلکہ دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دے

یا دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ایک حکیم نہیں بلکہ ایک کھلنڈرا ہے اور یہ دنیا ایک پر حکمت اور بامقصد کارخانہ نہیں بلکہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا ہے۔ دوسری یہ کہ بدی اور نیکی کے نتائج کے ظہور میں جو دیر سویر ہوتی ہے وہ سب حکمت پر مبنی ہوتی ہے، بسا اوقات شیطان کے پیروکاروں کو اللہ تعالیٰ مہلت دیتا ہے اور بسا اوقات اہلِ حق کسی آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں، اس سے نہ تو اہلِ باطل کو مغرور ہونا چاہیئے نہ اہلِ حق کو مایوس۔ بلکہ یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ وہ مہلت اور یہ آزمائش دونوں خدائے حکیم و دانا کی حکمت پر مبنی ہے اور اس حکمت کے تحت اس کے قوانین اور ان کے نتائج بالکل قطعی اور اٹل ہیں، ان میں سرِمُو فرق ممکن نہیں ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۲۱۰)

نظر ینظر کے معنی جس طرح دیکھنے کے آتے ہیں اسی طرح اس کے معنی انتظار کرنے کے بھی آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان بینات اور ان تنبیہات و تہدیدات کے بعد بھی جو لوگ جادۂ مستقیم پر ہموار نہ ہو سکے بلکہ شیطان کے پیچھے بھٹکتے ہی رہ گئے۔ اب سنت اللہ کے تحت تو ان پر اتمام حجت کے لیے کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اب بھی اگر وہ کسی چیز کے منتظر ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب وہ اس بات کے خواہش مند ہیں کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ اس طرح ان کو اپنا جلال دکھائے کہ اس کے ساتھ بدلیوں میں اس کا عذاب چھپا ہوا ہو اور اس کے جلو میں اس کے فرشتوں کی افواج قاہرہ ہوں اور حق و باطل کی اس کشمکش کا آخری فیصلہ کر دیا جائے۔ لیکن یہ فیصلہ نبی کے کرنے کا نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ ہی سے ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کس قوم کا فیصلہ کب ہونا چاہیئے اور کس طرح ہونا چاہیئے۔

معتبر ایمان

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان و ہدایت وہ معتبر ہے جو نتیجہ ہو آیاتِ الٰہی کے سننے اور سمجھنے کا نہ کہ وہ جو منتظر ہو جلالِ الٰہی اور قہر خداوندی کے ظہور اور مشاہدہ کا۔ جو گروہ اس چیز کا منتظر ہوتا ہے وہ صرف اپنی شامت کے ظہور کا منتظر ہوتا ہے اس لیے کہ وہ حقائق کو آنکھوں سے دیکھ کر ماننا چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو مطلوب یہ ہے کہ انسان اپنی عقل سے کام لے اور اس کے بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں کی رہنمائی کو قبول کرے۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰھُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۲۱۱)

ایمان کی راہ اہلِ عقل کے لیے کھلتی ہے

آیات بینات سے مراد ہیں وہ کھلے کھلے معجزات جو بنی اسرائیل کو دیے گئے۔ ان کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ ایمان و ہدایت کا راستہ ان لوگوں پر کھلتا ہے جو عقل اور سمجھ سے کام لیتے ہیں، جو عقل اور سمجھ سے کام نہیں لیتے وہ دنیا جہان کے معجزے دیکھ کر بھی بدستور اپنے تذبذب اور اپنی بے اعتقادی ہی میں پڑے رہتے ہیں۔ آخر دیکھو، بنی اسرائیل نے کتنے معجزے اپنی آنکھوں سے دیکھے، ان معجزات سے قطع نظر جو حضرت موسیٰ کے ہاتھوں سرزمین مصر پر ظاہر ہوئے، خود بنی اسرائیل کے لیے سمندر خشک ہوا، کوہ طور شق ہوا، ایک خشک پہاڑی

سے اکٹھے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، ایک صحرائے بے آب و گیاہ میں ان کے لیے من وسلویٰ کا خوانِ نعمت بچھا دیا گیا، غرض قدم قدم پر ان کے لیے معجزے ظاہر ہوئے لیکن جو بے اعتقادی ان پر روزِ اول سے مسلط تھی وہ بدستور مسلط رہی، پھر انھی کے نقشِ قدم پر چلنے والوں سے یہ توقع کس طرح کرتے ہو کہ اگر ان کے سامنے ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ ظاہر ہو جائے گا تو ان کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ یہ غلط ہے۔ ان کی آنکھیں بڑے سے بڑے معجزے دیکھنے کے بعد بھی بند ہی رہیں گی۔

بنی اسرائیل کی تاریخ کا حوالہ دینے میں خاص پہلو یہ ہے کہ جن منافقین کے حال پر یہاں تبصرہ ہو رہا ہے وہ زیادہ تر بنی اسرائیل ہی کے گروہ سے تعلق رکھنے والے تھے، اس وجہ سے ان کے سامنے انھی کی پچھلی تاریخ کا آئینہ رکھ دینے میں ایک نہایت ہی بلیغ تعریض ہے۔

'نعمۃ اللہ' سے مراد

"وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ" نِعْمَةَ اللّٰهِ سے مراد یہاں اللہ کی ہدایت اور شریعت ہے۔ اور اس کے بدلنے سے مراد یہ ہے کہ اس کی قدر کر کے اس کو ایمان و ہدایت کا ذریعہ بنانے کے بجائے اس کی ناقدری کر کے اس کو کفر کا ذریعہ بناتے ہیں۔ بعض مقامات میں تبدیلی کی اس نوعیت کی وضاحت بھی ہو گئی ہے۔ مثلاً فرمایا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا ۲۸-ابراھیم (ذرا دیکھو تو ان لوگوں کو جنھوں نے اللہ کی نعمت کو کفر سے بدل دیا) مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی اس عظیم نعمت کو پا کر اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے کسی ایسے نشان کے ظہور کے منتظر ہیں جو حق کے آگے ان کی گردنیں زبردستی خم کر دے تو وہ درحقیقت ہدایت کو ضلالت سے اور نعمت کو نقمت سے بدل رہے ہیں اور ایسے لوگ سنتِ الٰہی کے مطابق اللہ تعالیٰ کی سخت پاداش سے دوچار ہوتے ہیں۔

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲۱۲)

اہلِ باطل کا فریبِ نظر

یہ اس فریبِ نظر کی طرف اشارہ ہے جس میں مبتلا ہونے کے سبب سے اہلِ باطل اپنی باطل پرستیوں ہی میں مگن زندگی گزارتے چلے جاتے ہیں اور ان کو نبی اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے جب ان کی اس غفلت کے انجامِ بد کی خبر دی جاتی ہے تو ان کا مذاق اڑاتے اور ان کو زچ کرنے کے لیے عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں، جیسا کہ اوپر والی آیت میں اشارہ ہو چکا ہے۔

'حق و باطل' دونوں کے لیے مہلت کا قانون

فریبِ نظر یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں حق اور باطل اور کفر و ایمان دونوں کو مہلت ملی ہوئی ہے۔ کوئی شخص اگر نیکی اور اطاعت کی راہ اختیار کرتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ وہ ابتلاء کے قانون سے بالاتر ہو جائے بلکہ بعض حالات میں اس کا ابتلاء اس کے ایمان کے اعتبار سے سخت سے سخت تر ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کفر و نافرمانی کی زندگی گزارنا چاہتا ہے تو اس کے لیے بھی سنتِ الٰہی یہ نہیں ہے کہ فوراً خدا کے فرشتے اتر کر اس کی گردن ناپ دیں بلکہ اکثر حالات میں اس کو ایسی ڈھیل پر ڈھیل ملتی جاتی ہے کہ اس کی جسارت

دن بدن بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اسی فریبِ نظر کو یہاں 'زُیِّنَ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی اس دنیاوی زندگی کا
یہ فریب اس طرح ان کی نگاہوں میں کھبا دیا گیا ہے کہ وہ اس کے اس پہلو سے نگاہ ہٹا کر کسی اور پہلو سے
اس کو دیکھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے کہ ان کی نگاہوں میں اس زندگی کی اس خاص پہلو سے تزئین
شیطان نے کی ہے، جیسا کہ قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں اس کی تصریح ہے۔ اور یہ امر بھی ظاہر ہے کہ شیطان کو
اس تزئین کا موقع انسان کی عاجلہ پرستی اور اتباعِ شہوات نے فراہم کیا ہے۔

جو لوگ اس فریبِ نظر میں مبتلا ہوتے ہیں ان کو جب اہلِ ایمان ان کے اعمال و عقائد پر دنیا یا آخرت میں
کسی پکڑ یا سزا وغیرہ کی یاد دہانی کرتے ہیں تو وہ ان پر ہنستے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں کہ بتاؤ، تمھارا حال اچھا
ہے یا ہمارا، اگر ہمارا حال اچھا ہے اور ظاہر ہے کہ تم سے بدرجہا اچھا ہے تو ہم کیوں نہ سمجھیں کہ ہمارا ہی رویہ بھی
صحیح ہے۔ پھر جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی تمام بدمستیوں کے باوجود اس قسم کی کوئی گرفت ان پر نہیں ہو رہی ہے
جس کے ڈراوے اہلِ ایمان ان کو سناتے ہیں تو اپنی روش پر ان کا اطمینان اور بھی بڑھ جاتا ہے اور وہ ان کا
مذاق اڑانے میں اور بھی زیادہ دلیر ہو جاتے ہیں۔

'وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ' یعنی اس دنیا میں تو بلاشبہ صورتِ حال ایسی ہی ہے کہ
ظاہر پرست، اہلِ ایمان اور اہلِ تقویٰ کا مذاق اڑا سکتے ہیں اس لیے کہ اس دنیا کا کارخانہ جزا اور سزا کے قانون
پر نہیں چل رہا ہے بلکہ ابتلا کی سنت کے تحت چل رہا ہے لیکن اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی آنے والی
ہے جو جزائے اعمال کا مظہر ہوگی، اس دن وہ اہلِ ایمان جو دنیا کے اس فریبِ نظر میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ انھوں
نے تقویٰ کی زندگی گزاری ہے وہ بالا ہوں گے۔

یہاں صرف یہ فرمایا کہ وہ بالا ہوں گے، یہ نہیں بتایا کہ ان کے مذاق اڑانے والے کہاں ہوں گے۔ اس کی وجہ
یہ ہے کہ یہ چیز بالکل متعین تھی، اس کی خبر ان کو پیغمبر اور اہلِ ایمان کے انذار کے ذریعہ سے دے دی گئی تھی
اس وجہ سے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ اہلِ ایمان کی فوقیت کی وضاحت کے لیے یہ فرما دیا کہ 'اللہ
جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔' 'رزق' تعبیر ہے اللہ تعالیٰ کے فضل کی اور اس فضل کے بابت ارشاد
ہوا کہ بے حساب ہوگا، یعنی توقعات اور اندازوں، قیاسوں اور گمانوں کے تمام پیمانے ان کے ناپنے سے قاصر
رہ جائیں گے۔ اس حقیقت کی تمثیل بعض احادیث میں نہایت مؤثر انداز میں پیش کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل دوسرے
مقام میں آئے گی۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ
بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ
بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ
بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲۱۳)

اہل ایمان کی حوصلہ افزائی

اوپر اہل ایمان کے ساتھ کفار و منافقین کے مذاق و استہزا کا ذکر ہوا ہے، اب اس آیت میں اہل ایمان کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے کہ اطمینان رکھو، موقف حق پر تم ہی ہو، اختلافات و نزاعات کے درمیان فیصلہ کرنے والی حقیقت تمہارے ہی پاس ہے اور کفر و ضلالت کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے کے اندر صرف تمہی ہو جن کو صراط مستقیم کی ہدایت نصیب ہوئی ہے۔ یہ کفار و منافقین جو تمہاری مخالفت کر رہے ہیں اور تمہارا مذاق اڑا رہے ہیں یہ سب اس باہمی ضد اور عناد کا کرشمہ ہے جس میں یہ ہمیشہ سے مبتلا ہیں اور اس میں مبتلا ہونے کی وجہ سے یہ خدا کی ہدایت کے ایسے دشمن ہو گئے ہیں کہ نہ اس کو خود پانا چاہتے اور نہ کسی دوسرے کو پانے دینا چاہتے تو تم ان کی ان مخالفانہ سرگرمیوں کے باوجود اپنے موقف پر جمے رہو۔ آزمائش کا یہ دور، جو اللہ تعالیٰ کی سنت کے تحت ہے، گزر جانے کے بعد کامیابی اور فتح مندی تمہارے ہی لیے ہے۔

"کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً" میں "کَانَ" ہمارے نزدیک تامہ ہے۔ دوام کے مفہوم میں جیسا کہ کَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کا تعلق ہے اس نے لوگوں کو ایک ہی دین دیا اور ایک ہی امت بنایا، جیسا کہ فرمایا ہے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ہمیشہ سے اللہ کا دین اسلام ہی ہے فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا یہی دین فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا اور یہی دین ہے جو اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے لوگوں کی رہنمائی کے لیے بھیجا۔ نہ اس نے اسلام کے سوا کسی اور دین کو پسند فرمایا نہ امت مسلمہ کے سوا کوئی امت بنانی چاہی۔ اس کے ہاں دین صرف اسلام اور امت صرف امت مسلمہ ہے۔

آیت ۲۱۳ میں ایجاز کی تفصیل

کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً کے بعد فَاخْتَلَفُوْا کا لفظ محذوف ہے۔ اس محذوف کو آگے چل کر کھول دیا ہے چنانچہ فرمایا ہے لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ۔ یہ حذف عربی اسلوب کے مطابق تکرار سے بچنے کے لیے فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تو ایک ہی دین دیا اور ایک ہی امت بنائی لیکن لوگوں نے اس دین میں اختلاف کیا اور اس کے نتیجے میں تحزب اور گروہ بندی میں مبتلا ہوئے تو اللہ نے اپنے انبیا بھیجے کہ وہ لوگوں کو دین میں اختلاف کے نتائج بد سے آگاہ کریں اور حق پر قائم رہنے والوں کو کامیابی اور نجات کی خوشخبری سنا دیں۔ اللہ نے ان نبیوں کو کتابیں عطا فرمائیں، یہ کتابیں حق یعنی قول فیصل کے ساتھ اتریں تاکہ ان تمام نزاعات کا جو دین حق میں پیدا کر دی گئی تھیں، فیصلہ کر کے از سر نو حق کو اجاگر کر دیا جائے۔ لیکن جن امتوں کو یہ حق عطا ہوا انھوں نے نہایت واضح دلائل کی روشنی میں اس حق کو سمجھ لینے کے بعد محض آپس کی ضد م ضدا کے سبب سے خود ہی اس حق میں اختلاف کیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار حق کی وضاحت کے باوجود اختلاف قائم ہی رہا اور انھی لوگوں کے ہاتھوں قائم رہا جو اس حق کے امین بنائے گئے تھے۔

اب اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق سے اس نزاع و اختلاف میں حق کی راہ پھر اس قرآن کے ذریعہ سے اہل ایمان یعنی پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں پر کھولی ہے اور اللہ ہی ہے جو اپنی مشیت

اور حکمت کے تقاضوں کے مطابق جس کو چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی ہدایت دیتا ہے۔

امت مسلمہ کی عظیم ذمہ داری

اس آخری ٹکڑے کے اندر اس عظیم ذمہ داری کی طرف اشارہ بھی ہے جو اس امت پر دین حق کی امانت سے متعلق عائد ہوتی ہے کہ اس حق کو پاکر تم بھی اس میں اس طرح کے اختلافات برپا کرنے والے نہ بن جانا جس طرح دوسرے تم سے پہلے بن گئے اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ بازی کوئی آسان بازی نہیں ہے بلکہ یہ بڑی جان جوکھوں کا کام ہے، دینداری اور حق پرستی کے پشتینی ٹھیکیدار، جن کے کاروبار کی ساری کامیابی کا دار و مدار حق کے گم ہی رہنے میں ہے، تمھیں آسانی سے نہیں چھوڑیں گے بلکہ تمھارے پیچھے جھاڑ کے کانٹے بن کر پڑ جائیں گے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (۲۱۴)

حاملین حق کے لیے امتحان کی کسوٹی

یہ اس سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے جس کی کسوٹی پر ہر وہ جماعت پرکھی جاتی ہے جو اصل حق کی حامل بن کر اٹھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ منافقین اور کفار کی اس مخالفت اور اس استہزا سے گھبرا نہ جاؤ، ابھی تو اس راہ عشق کی یہ ابتدا ہے، آگے اس سے کہیں کٹھن مقامات آنے ہیں، تمھیں بھی ان سارے مراحل سے گزرنا ہے جن سے تم سے پہلے اٹھنے والے حاملین حق کو گزرنا پڑا ہے، تم سے پہلے جنھوں نے اس راہ میں قدم رکھے ان کو ایسے مصائب و شدائد پیش آئے اور وہ آزمائشوں کے ہاتھوں اس طرح جھنجھوڑ دیے گئے کہ رسول اور اس کے ساتھی سب مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ پکار اٹھے۔

حَتّٰى يَقُوْلَ ہمارے نزدیک حال کے معنی میں ہے اور مقصود اس سے تصویرِ حال ہے۔ اور مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ کا اسلوب اس فریاد کو ظاہر کرتا ہے جس کی نوعیت امید کے دروازے پر آخری دستک کی ہوتی ہے۔ فرمایا کہ نصرتِ الٰہی کا دروازہ اسی دستک کی کلید سے کھلتا ہے۔ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۔

رہروِ تشنہ لب نہ گھبرانا اب لیا چشمۂ بقا تو نے

۷۰۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۲۱۵-۲۲۱

اوپر کا مضمون، واضح ہو چکا ہے کہ حج کے مضمون سے بطور ایک التفات کے پیدا ہو گیا تھا جس سے اہل نفاق کو ایک مناسب موقع تنبیہ ہو گئی اور اہل ایمان کو ایک برمحل تذکیر۔ اصل سلسلہ بیان حج اور جہاد و انفاق سے متعلق تھا چنانچہ اس ضمنی مضمون کے ختم ہونے کے بعد وہ سلسلۂ کلام پھر لوٹ آیا اور مذکورہ چیزوں سے متعلق اس دوران میں لوگوں کے اندر جو سوالات پیدا ہوئے ان کے جوابات دیے گئے۔

عربِ جاہلیت کی سوسائٹی میں جوئے اور شراب کا جوڑ

یہ سوالات، جیسا کہ آگے کی تفصیلات سے واضح ہوگا، انھی مسائل سے متعلق ہیں جو اوپر زیرِ بحث آئے ہیں، البتہ شراب اور جوئے سے متعلق جو سوال ہے وہ اس موقع پر ان لوگوں کو شاید بے جوڑ معلوم ہو جو عرب کے اس زمانے کے تمدنی و معاشرتی حالات سے واقف نہیں ہیں جس زمانے میں یہ آیتیں اتری ہیں۔ یہ سوال درحقیقت اس انفاق کے تعلق سے یہاں پیدا ہوا ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

اہلِ عرب کی ایک محبوب روایت

ہم آیات کی وضاحت کرتے ہوئے بتائیں گے کہ عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں جوئے اور شراب کے جہاں بہت سے مضر پہلو تھے وہاں ان کے بعض مفید پہلو بھی تھے۔ عرب کے سخی اور حوصلہ مند لوگوں میں یہ روایت تھی کہ قحط، خاص طور پر سردیوں کے زمانے میں، وہ جگہ جگہ اکٹھے ہوتے، خوب شراب پیتے، پھر شراب کی مستی میں جس کسی کے اونٹ یا اونٹنی کو چاہتے ذبح کر دیتے، پھر اس کے مالک کو منہ مانگے دام دے دیتے اور اس کے گوشت پر جوا کھیلتے اور ہر شخص جتنا گوشت جیتتا جاتا وہ ان غریبوں اور فقیروں میں لٹاتا جاتا جو اس طرح کی کسی تقریب کی خبر سن کر موقع پر پہلے ہی سے جمع ہو جاتے۔ یہ روایت عرب میں بڑی محبوب روایت تھی۔ جب شمال کی ٹھنڈی ہوائیں چلتیں اور ملک میں قحط کی سی حالت پیدا ہو جاتی تو جو لوگ اس قسم کی تقریبیں منعقد کرتے یا ان میں شریک ہوتے ان کو بڑا سخی داتا سمجھا جاتا اور سوسائٹی میں ان کی بڑی عزت ہوتی۔ اس کے برعکس جو لوگ اس چیز سے الگ الگ رہتے ان کے لیے ایک خاص لفظ 'برم' کا استعمال ہوتا جس کے معنی بخیل کے ہیں۔

عرب شعرا اس جوئے اور شراب کا ذکر اپنے قصائد میں بڑی دھوم دھام سے کرتے ہیں۔ میں یہاں بعض مشہور شعرا کے کلام کے حوالے نقل کرنا چاہتا تھا لیکن اس قسم کی خاص علمی چیزوں سے عام قارئین کچھ زیادہ فائدہ نہیں اٹھاتے اس وجہ سے ان کو نظر انداز کرتا ہوں۔

غرض جوئے اور شراب کا یہ پہلو تھا جس کی وجہ سے عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں ان کا شمار فیاضی اور سخاوت کے خصائل اور خدمتِ خلق اور ہمدردی غربا کے محرکات میں سے ہوتا تھا۔ چنانچہ جب قرآن نے انفاق اور ہمدردی غربا پر بہت زور دیا تو بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ جب اسلام غریبوں اور یتیموں کی ہمدردی اور ان کی امداد کے لیے مال خرچ کرنے پر اتنا زور دیتا ہے تو آخر اس جوئے اور شراب میں کیا خرابی ہے جو قحط کے زمانے میں غربا کی امداد کا ذریعہ بنتے ہیں۔ قرآن نے یہاں اسی سوال کو نقل کر کے اس کا جواب دیا ہے کہ اس میں شبہ نہیں کہ ان چیزوں سے سوسائٹی کو بعض اعتبارات سے کچھ فائدے تو ضرور پہنچ جاتے ہیں لیکن ان سے فرد اور سماج دونوں کو جو مادی و اخلاقی نقصانات پہنچتے ہیں وہ ان کے فوائد کی نسبت سے بہت زیادہ ہیں اس وجہ سے اسلام نے ان کو حرام قرار دیا۔

یہ سوال بالکل اسی طرح کا سوال ہے جس طرح کا سوال وہ لوگ اٹھاتے ہیں جو آج قحط، زلزلہ اور سیلاب وغیرہ کے مصیبت زدوں کی امداد کے لیے فنڈ جمع کرنے کی خاطر رقص و سرود کی مجلسیں منعقد کرتے ہیں یا سنیما کے

شو دکھاتے ہیں یا فلم اشاروں کے مظاہرے اور ان کے میچ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو بھی اگر ان بُرے راستوں کے اختیار کرنے پر (اگرچہ وہ کسی اچھے ہی مقصد سے اختیار کیے گئے ہوں) ملامت کی جائے تو وہ کہتے ہیں کہ جب ہم یہ کام انسانیت کی خدمت کے لیے کر رہے ہیں تو آخر اس میں کیا خرابی ہے؟ درحقیقت یہ لوگ بھی عرب جاہلیت کی طرح اپنی ان حماقتوں کے صرف انھی پہلوؤں کو دیکھتے ہیں جو ان کی نگاہوں میں بظاہر نفع عوام کے ہیں، ان کی نظر ان ہولناک نقصانات کی طرف نہیں جاتی جو ان سے پورے معاشرے کو پہنچتے ہیں۔ یہاں ہم صرف اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔ آگے آیات کی تفسیر کے تحت اس کی ضروری تفصیل آئے گی۔

اسی طرح اس ضمن میں یتامیٰ سے متعلق بھی ایک سوال پیدا ہوا۔ اوپر انفاق کے سلسلہ میں والدین اور اقربا کے ساتھ یتیموں کا بھی حوالہ دیا گیا تھا کہ اس انفاق کے مستحق وہ بھی ہیں۔ ان کے متعلق یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنے خاندان کے کسی یتیم کے معاملات کو جس کی اس کے سر ذمہ داری ہے، اپنے ساتھ شامل کر لے اور اس کی ماں کے ساتھ نکاح کر لے تو اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔ یہاں قرآن نے اس سوال کے بھی بعض پہلوؤں کو واضح فرمایا۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت کیجیے تو وہ بالکل مربوط کڑیوں کی شکل میں نظر آئیں گی۔

آیات ۲۱۵-۲۲۱

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ ع ۲۶ / ۱۰

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَ

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢١٧﴾ إِنَّ الَّذِينَ
آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ
يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٢١٨﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ
الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ
إِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا ۗ وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ
الْعَفْوَ ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢١٩﴾ فِي
الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۗ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ ۖ قُلْ إِصْلَاحٌ لَهُمْ
خَيْرٌ ۖ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ
الْمُصْلِحِ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَعْنَتَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٢٠﴾
وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ ۚ وَلَأَمَةٌ مُؤْمِنَةٌ خَيْرٌ
مِنْ مُشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ ۗ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ
يُؤْمِنُوا ۚ وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ ۗ أُولَٰئِكَ
يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ
بِإِذْنِهِ ۖ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٢٢١﴾ ع ٢٧ / ١١

ترجمہ آیات ٢١٥ - ٢٢١

وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟ کہہ دو جو مال بھی تم خرچ کرتے ہو تو وہ والدین، قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے اور جو نیکی بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ٢١٥

تم پر کفار سے جنگ فرض کی گئی اور وہ تمہارے لیے ایک ناگوار شے ہے۔ ممکن ہے

تم ایک شے کو ناگوار خیال کرو حالانکہ وہ تمھارے لیے بہتر ہو اور ممکن ہے کہ تم ایک شے کو پسندیدہ سمجھو اور وہ تمھارے لیے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ ۲۱۶

وہ تم سے شہر حرام میں جنگ کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو اس میں جنگ بڑی سنگین بات ہے۔ لیکن اللہ کے راستہ سے روکنا، اس کا کفر کرنا، مسجد حرام سے روکنا اور اس کے لوگوں کو اس سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس جنگ سے بھی زیادہ سنگین ہے اور جبر و ظلم کے ذریعہ سے لوگوں کو دین سے پھیرنا قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اور یہ لوگ تم سے برابر جنگ کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ تم کو تمھارے دین سے پھیر دیں اگر وہ پھیر سکیں اور تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے گا اور حالت کفر میں مرے گا تو یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے اور یہی لوگ دوزخ میں پڑنے والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ البتہ جو لوگ ایمان پر جمے رہیں گے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہ اللہ کی رحمت کے متوقع ہیں۔ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ۲۱۷-۲۱۸

وہ تم سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو ان دونوں چیزوں کے اندر بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں لیکن ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑھ کر ہے۔

اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں کہہ دو کہ جو ضروریات سے بچ رہے۔ اسی طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم غور کرو، دنیا اور آخرت دونوں کے معاملات میں۔ ۲۱۹

اور وہ تم سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو جس میں ان کی بہبود ہو وہی بہتر ہے

اور اگر تم ان کو اپنے ساتھ شامل کر لو تو وہ تمھارے بھائی ہی ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ کون بگاڑ چاہنے والا ہے اور کون بہبود، اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو مشقت میں ڈال دیتا۔ بے شک اللہ غالب و حکیم ہے۔ ۲۲۰

اور مشرکہ عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لائیں نکاح نہ کرو، ایک مومنہ لونڈی ایک آزاد مشرکہ سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمھیں بھلی لگے اور مشرکوں کو جب تک وہ ایمان نہ لائیں اپنی عورتیں نکاح میں نہ دو، ایک مومن غلام ایک آزاد مشرک سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمھیں بھلا لگے، یہ لوگ دوزخ کی طرف بلانے والے ہیں اور اللہ اپنی توفیق بخشی سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور اپنی آیتیں لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ ۲۲۱

۱۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۥ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (۲۱۵)

سوال کرنے والوں کی بیمار پردہ ذہنیت

اس سورہ میں شروع ہی سے انفاق اور زکوٰۃ کا حکم بار بار آ رہا ہے۔ خاص طور پر آیت ۹۵ میں بیت اللہ کی آزادی کے جہاد کے سلسلے میں بڑی تاکید سے انفاق پر ابھارا ہے۔ وہاں ہم نے اشارہ کیا ہے کہ اگرچہ الفاظ کے لحاظ سے تو خطاب عام ہے لیکن روئے سخن درحقیقت ان مسلمانوں کی طرف ہے جو جان و مال کی قربانی میں کمزور تھے۔ قاعدہ ہے کہ آدمی کے دل میں اگر کسی چیز سے متعلق کمزوری ہو، وہ اس کے کرنے کی ہمت نہ کر رہا ہو تو وہ اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لیے بار بار سوال کرتا ہے اور اس طرح گویا وہ یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ جہاں تک اصل کام کا تعلق ہے اس کو کرنے کے لیے تو وہ جی جان سے حاضر ہے لیکن کرے کیا کہ ابھی تو اصل بات ہی اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ یہی بھید ہے کہ سوالات سچے اور پکے مسلمانوں کی طرف سے بہت کم کیے گئے زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے کیے گئے جو کم ہمت اور بخیل تھے اور اپنی اس کمزوری کو سوالات کے پردے میں چھپانا چاہتے تھے۔ اسی طرح کے لوگ تھے جنھوں نے انفاق کے حکم کے جواب میں یہ سوال اٹھایا جس کا آیت

زیر بحث میں حوالہ دے کر جواب دیا گیا ہے۔ اس سوال سے خود اس بات کا اظہار ہو رہا ہے کہ گویا وہ انفاق کے مطالبوں سے دبے جا رہے ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ مطالبے کس حد پر جا کر رکیں گے۔ چنانچہ قرآن نے سوال کرنے والوں کی اس ذہنیت کو سامنے رکھ کر جواب دیا ہے اور اس جواب کے دو حصے ہیں۔

جواب کے دو پہلو

ایک حصہ تو یہ ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والوں کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ وہ جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں اس کا کوئی حصہ بھی خدا کے جیب میں نہیں جاتا، وہ کسی کے مال و اسباب کا محتاج نہیں ہے بلکہ وہ ایک ہاتھ سے جو کچھ لیتا ہے دوسرے ہاتھ سے ہماری ہی طرف لوٹا دیتا ہے، ہمارے ہی ماں باپ، ہمارے ہی خویش و اقارب، ہمارے ہی یتیم، ہمارے ہی مسکین اور ہمارے ہی مسافر ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ گویا خدا کی راہ میں ہم جو کچھ خرچ کرتے ہیں، کسی دوسرے کی خدمت پر نہیں بلکہ اپنی ہی خدمت پر خرچ کرتے ہیں۔ بس فرق ہے تو یہ ہے کہ اس خرچ کی نوعیت ایک اجتماعی نظم کی ہے جس کا فائدہ سب کو بحیثیت مجموعی پہنچتا ہے۔ یہی حقیقت حضورؐ نے تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَآئِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَآئِهِمْ (ان کے مالداروں سے لے کر ان کے غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے) کے الفاظ سے واضح فرمائی اور اسی بات کی طرف سورۂ سبا کی آیت قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۴۷ (کہہ دو میں نے جو تم سے اجر مانگا ہے وہ تمہارے ہی لیے ہے) بھی اشارہ کر رہی ہے۔

اس جواب کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان جو نیکی بھی کرتا ہے اسے اطمینان رکھنا چاہیئے کہ اس کا ایک ایک ذرہ سب خدا کے علم میں ہے۔ کوئی چیز نہ تو اس کے علم سے باہر ہے اور نہ کسی چیز کو وہ فراموش کرنے والا ہے، پھر جب وہ سب کچھ جانتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس کا بھرپور صلہ بھی دے گا، پھر جب ہر چیز کا صلہ ملنے والا ہے اور وہ بھی دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک تو ایسے نفع بخش کاروبار میں سرمایہ لگانے سے انسان کیوں گھبرائے؟ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۱۲۱۔ توبہ (اور وہ خدا کی راہ میں جو چھوٹا یا بڑا انفاق کرتے ہیں یا کوئی وادی قطع کرتے ہیں تو یہ ان کے لیے لکھ لیا جاتا ہے تاکہ اللہ ان کو اس سے بہتر بدلہ دے)

ناگزیر حالات میں انفاق فی سبیل اللہ کی آخری حد

یہ جواب اگرچہ نہایت واضح اور جامع تھا لیکن اس کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ غالباً اسی کمزوری کے سبب سے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، سوال کرتے ہی رہے چنانچہ آگے آ رہا ہے وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ، قُلِ الْعَفْوَ ۲۱۹ (اور وہ تم سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہہ دو کہ جو ضروریات سے فاضل بچ رہے) اس جواب نے انفاق کی آخری حد معین کر دی کہ یہ انفاق چونکہ امت کے تحفظ و بقا کے جہاد کے سلسلہ کا انفاق ہے اس وجہ سے اس میں دین کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان اپنی ناگزیر ضروریات سے جو کچھ بچا سکے وہ سب خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے تیار رہے۔

مولانا فراہیؒ اس آیت کو ذرا اس سے مختلف زاویہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کی تاویل یہ ہے کہ چونکہ یہ انفاق اس جہاد کے لیے تھا جس کا حکم خانہ کعبہ کو مشرکین کے قبضہ سے آزاد کرانے کے لیے ہوا تھا اس وجہ سے اس

نے مسلمانوں کی ساری توجہ اپنی طرف جذب کر لی اور اس جہاد کی تیاریوں میں وہ اس قدر منہمک ہو گئے کہ انفاق کے دوسرے مصارف — والدین، اقربا، یتامیٰ، مساکین وغیرہ — کی طرف ان کو وہ توجہ نہیں رہی جو ہونی چاہیئے تھی اس وجہ سے لوگوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ انفاق کی مقدار کیا ہو۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ خدا کی راہ میں جو کچھ خرچ کیا جائے اس کے اوّل حق دار وہ مستحقین ہیں جن کا ذکر ہوا، پھر مزید جو کچھ خرچ کیا جائے تو وہ سب اللہ کے علم میں رہے گا اور وہ اس کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ یہاں مقدار کی تشریح نہیں فرمائی کہ لوگ خود اپنی عقل سے کام لیں اور مختلف دینی ضروریات میں توازن قائم کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی بعض لوگوں کے ذہن میں مقدار سے متعلق شبہ رہ گیا تو انھوں نے پھر سوال کیا۔ ان کے جواب میں یہ تصریح کر دی گئی کہ جو کچھ مستحقین سے فاضل بچے وہ خرچ کرو، چونکہ اوپر مستحقین کا ذکر ہو چکا تھا اس وجہ سے یہ مختصر جواب کافی ہوا۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲۱۶)

جہادِ مالی اور جہادِ جانی

اوپر یہ بات تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے کہ یہ انفاق اور یہ جنگ دونوں ایک ہی سلسلے کی باتیں ہیں اس لیے کہ جہاد جان اور مال دونوں سے ہوتا ہے۔ اوپر والی آیت میں اس تردد کو دور کیا ہے جو بعض ذہنوں میں مالی قربانی سے متعلق پیدا ہوا اب اس آیت میں وہ تردد رفع کیا جا رہا ہے جو جان کی قربانی کے معاملہ میں تھا۔ اس تردد کو رفع کرنے کے لیے ایک اصولی حقیقت جو واضح فرمائی وہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے فوز و فلاح اور عروج و کمال کا راستہ خود نہیں طے کر سکتا ہے بلکہ وہ خدا ہی طے کر سکتا ہے جس نے اس کو پیدا کیا ہے، اس لیے کہ اسی کو علم ہے کہ انسانی فطرت کے مضمرات اور اس کی صلاحیتیں کیا ہیں اور وہ طریقے اور قاعدے کیا ہیں جن کو اختیار کر کے وہ اپنی تمام صلاحیتیں اجاگر کر سکتا ہے۔ اگر اپنے لیے خیر و شر کا فیصلہ کرنے کا سارا معاملہ انسان کی اپنی ہی خواہش اور اس کی اپنی ہی عقل پر چھوڑ دیا جاتا تو عجب نہیں کہ وہ اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں اپنی زندگی کے پروگرام سے وہ ساری باتیں ایک ایک کر کے خارج کر دیتا جو اس کے عروج و کمال اور اس کے روحانی و اخلاقی ارتقا کا ذریعہ ہیں کیونکہ ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جو اس کے نفس کے لیے دل پسند ہو بلکہ ایک سے ایک بڑھ کر نفس پر شاق گزرنے والی ہیں۔ اسی طرح اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ وہ اپنے اندر وہ ساری باتیں جمع کر لیتا جو اس کو اسفل سافلین میں لے جانے والی ہیں کیونکہ یہ ساری باتیں نفس کے لیے نہایت آسان اور لذیذ ہیں۔ انسانی فطرت کا یہ عجیب رمز ہے کہ جو چیزیں اس کے نفس کو مرغوب ہیں وہ اس کو پست کرنے والی ہیں اور جو چیزیں اس کو بلند کرنے والی ہیں وہ اس کے نفس کو عموماً بہت شاق ہیں۔ اس وجہ سے اس کی فلاح کی راہ بتانے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی ہے اور اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ سے اس کی رہنمائی کی ہے۔

جہاد کا ایک خاص پہلو

جنگ و جہاد کے معاملے کی نوعیت بھی بعینہٖ یہی ہے۔ اس کے ظاہری پہلو پر نگاہ ڈالی جائے تو اس سے زیادہ ہولناک چیز کیا ہو سکتی ہے، لیکن بسا اوقات، اس ہولناک شئے کو سب سے زیادہ محبوب بنانا پڑتا ہے اس لیے کہ اگر اس سے گریز کیا جائے تو تمام انسانی اقدار بالکل تباہ ہو کر رہ جائیں۔

یہ جو فرمایا ہے کہ "اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے" تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان کسی معاملے میں خیر و شر کے پہلو کو متعین کر ہی نہیں سکتا، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو اس راہ میں بہت سے مغالطے پیش آتے ہیں اس وجہ سے وہ بسا اوقات ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ یہ صرف اللہ ہی کی شان ہے کہ اس کا علم ظاہر و باطن اور ماضی و مستقبل سب کو محیط ہے اس وجہ سے اس نے انسان کی رہنمائی کے لیے زندگی کا سارا پروگرام خود بنا کر نازل فرما دیا ہے۔ اور یہ پروگرام ایسا جامع ہے کہ اس کی دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی و ترقی کا ضامن ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَھْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَھُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۱۷)

اشہر حرم سے متعلق مزید سوال اور ان کے جواب

اوپر آیات ۱۹۰-۱۹۵ میں اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا تھا کہ اگر مشرکین تمھارے ارادہ حج میں مزاحم ہوں اور ان کی مزاحمت کے سبب سے جنگ کی نوبت آجائے تو تم ان سے جنگ کرو اور ان کو قتل کرو اگرچہ یہ جنگ اشہر حرم میں بلکہ عین حدود حرم میں لڑنی پڑے۔ یہ بات اگرچہ واضح تھی لیکن اشہر حرم کے معاملہ میں زمانہ جاہلیت سے عربوں کی روایات اتنی سخت تھیں اور ان میں جنگ و خونریزی کو وہ اتنا بڑا گناہ سمجھتے تھے کہ بہت سے لوگوں کے دلوں میں یہ بات آسانی سے نہیں اتر سکتی تھی۔ اس طرح کے معاملات میں چونکہ جذبات کو بڑا دخل ہوتا ہے اس وجہ سے مخالفین کو پروپیگنڈے کا بھی بڑا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق لوگوں کی طرف سے سوال ہوا اور قرآن نے اس سوال کا تفصیل سے جواب دیا۔

اشہر حرم کی حرمت کا قصاص

قرآن نے جس طرح اوپر کی آیات میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ اشہر حرم میں قتل و خونریزی بڑا سنگین گناہ ہے اسی طرح یہاں بھی اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ "قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ" (کہہ دو کہ اشہر حرم میں جنگ کرنا بڑی سنگین بات ہے) لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح فرما دی ہے کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنا، اللہ کا کفر کرنا، مسجد حرام سے اللہ کے بندوں کو محروم کرنا اور جو اپنے اعمال و عقائد کے اعتبار سے اس مسجد حرام کے سب سے زیادہ حقدار رہیں ان کو یہاں سے ہجرت پر مجبور کرنا، اشہر حرم میں جنگ کرنے سے بھی بڑے جرائم ہیں، اس وجہ سے اگر ان سنگین تر جرائم کے سدباب کے لیے اشہر حرم میں جنگ کرنی پڑ جائے تو یہ اشہر حرم کی حرمت کا قصاص ہوگا اور یہ گناہ نہیں بلکہ بہت بڑی نیکی ہے۔

فتنہ کا استیصال

پھر خاص طور پر "فتنہ" کا حوالہ دیا ہے کہ "اَلْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ" کہ یہ فتنہ جو مکہ میں پایا جا رہا ہے یہ تو قتل سے بھی کہیں زیادہ سنگین جرم ہے۔ فتنہ کی تحقیق ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ اس سے مراد وہ سنگدلانہ اذیتیں اور تکلیفیں ہیں جو کفار و مشرکین مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے کے لیے پہنچا رہے تھے۔ فرمایا کہ یہ فتنہ تو قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ پھر جب یہ فتنہ آج علی بلد امین اور بلد حرام میں موجود ہے، نہ سرزمینِ حرم کا احترام اس سے ظالموں کو روک رہا ہے اور نہ اشہر حرم کا احترام اس میں مانع ہے تو آخر مظلوموں کی مدافعت ہی کے لیے اشہر حرم میں جنگ کیوں گناہ ٹھہرے!

پھر اس فتنہ کی سنگینی کو واضح کرنے کے لیے فرمایا کہ کفار و مشرکین مسلمانوں کو دینِ حق سے پھیرنے کے لیے جو مظالم کر رہے ہیں ان کی نوعیت صرف انفرادی واقعات ہی کی نہیں ہے جو کسی وقتی جوش کے تحت صادر ہو گئے ہوں بلکہ مسلمانوں کو دین سے پھیرنے کے لیے یہ لوگ خونریز جنگوں کا ایک سلسلہ چھیڑنے کے منصوبے بنا رہے ہیں اور یہ (اگر ان کے امکان میں ہو تو) اس وقت تک دم لینے والے نہیں ہیں جب تک تمھیں اسلام سے پھیرنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ کیا ایسے سخت و شدید فتنہ کے مقابلہ کے لیے بھی اشہر حرم میں لڑائی گناہ ہی رہے گی۔

ایک مناسب موقع تنبیہ

یہاں تک تو اصل سوال کا جواب تھا۔ اس کے بعد ارتداد کے ذکر کے تعلق سے ایک مناسب موقع تنبیہ مسلمانوں کو بھی کر دی کہ اگر ان کے ظلم و ستم سے مرعوب ہو کر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا اور اسی حالت میں مر جائے گا تو اس کے تمام اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت ہو جائیں گے اور وہ دوزخ میں پڑے گا جس میں ہمیشہ رہے گا۔ یہاں اکارت ہونے کے لیے حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اعمال سے مراد وہ اعمال ہیں جو بظاہر نیکی کے ہیں اور حبط سے مراد ان کا بالکل بے نتیجہ اور بے اثر ہو جانا ہے۔ یعنی اس کفر کے بعد اس نے اسلام کے جو کام کیے وہ بھی بالکل برباد ہو کر رہ جائیں گے۔

ارتداد کی سزا

اس آیت میں ایک خاص نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے۔ اعمال کے اکارت ہونے کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت ہو کر رہ جائیں گے، حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ آخرت میں مرتد ہو جانے والوں کے اعمال کا اکارت ہو جانا تو واضح ہے البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں ان کے اعمال کے اکارت ہونے کی شکل کیا ہو گی؟ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص مرتد ہو جاتا ہے وہ اسلامی ریاست میں جملہ شہری حقوق سے محروم ہو جاتا ہے، ریاست پر اس کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری باقی نہیں رہتی چنانچہ اسی اصول پر اسلامی تعزیرات کا وہ قانون مبنی ہے جو مرتدوں کی سزا سے متعلق ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۱۸)

اہلِ استقامت کا مقام

کفار کے ظلم و ستم سے گھبرا کر مرتد ہو جانے والوں کا انجام بتانے کے بعد ان لوگوں کا مقام بھی بتا دیا جو

کفار کی ان تمام ستم رانیوں کے باوجود اپنے ایمان پر جمے رہیں گے اور ہجرت و جہاد کی بازیاں کھیلیں گے۔ ان لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ بے شک اس بات کے سزاوار ہیں کہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہوں۔ موقع و محل دلیل ہے کہ یہاں لفظ "اٰمَنُوْا" اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے، اسی وجہ سے ہم نے اس کا ترجمہ "اپنے ایمان پر جمے رہے" کیا ہے۔

اس وقت ہجرت اور جہاد مسلمانوں پر بیک وقت دونوں واجب تھے، بیت اللہ کی آزادی اور فتنہ کے قلع قمع کے لیے جہاد کا بھی حکم ہو چکا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت اور ایمان کے تحفظ کے لیے ہجرت کا بھی، اور یہ دونوں ہی معرکے بڑے سخت تھے اس وجہ سے ان دونوں ہی باتوں کا ذکر فرمایا۔ اس میں مسلمانوں کے لیے یہ رہنمائی بھی تھی کہ کفار کی ستم رانیوں کا جواب ارتداد نہیں بلکہ ہجرت اور جہاد ہے۔

جو لوگ یہ بازیاں کھیل سکیں ان کے متعلق فرمایا کہ یہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہو سکتے ہیں۔ یعنی یقین تو ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد بھی کسی کو نہیں کرنا چاہیئے، اس لیے کہ کوئی بھی اپنے عمل سے نجات نہیں حاصل کرے گا بلکہ جس کو بھی نجات حاصل ہو گی خدا کی بخشش اور اس کی مہربانی ہی سے ہو گی، چنانچہ آگے فرمایا وَاللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ ؕ قُلْ فِیْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ؗ وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَا ذَا یُنْفِقُوْنَ ؕ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ (۲۱۹)

جوئے اور شراب سے متعلق سوال کی نوعیت

اوپر فصل کی تمہید میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ شراب اور جوئے سے متعلق یہ سوال ان کے ان فوائد کو سامنے رکھ کر بعض لوگوں نے کیا جو اس وقت کی عرب کی مخصوص سوسائٹی کی روایات کی بنا پر ان میں پائے جاتے تھے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں جوئے اور شراب کی نوعیت موجودہ قمار بازی اور موجودہ بادہ خواری سے بالکل مختلف تھی۔ ہمارے ہاں جوا نری قسمت آزمائی اور بربادی اور شراب نوشی نری عیاشی ہے لیکن عرب جاہلیت میں ان کے اندر ہمدردیٔ خلق کے بعض ایسے پہلو بھی تھے جن کی بنا پر اہل عرب ان کو رذائل میں نہیں بلکہ فضائل میں گنتے تھے۔ اسی پہلو سے یہاں انفاق اور جہاد کے سلسلے میں ان کے متعلق بھی سوال پیدا ہوا کہ انفاق کی ایک راہ تو یہ بھی ہے کہ قحط کے زمانے میں مالدار لوگ شراب پیتے اور جوا کھیلتے ہیں اور جو کچھ جیتتے جاتے ہیں وہ غریبوں میں لٹاتے جاتے ہیں، پھر اس کے متعلق قرآن کا کیا ارشاد ہے؟

مضر چیز کے بارے میں اسلامی شریعت کا مزاج

قرآن نے اس کا جواب دیا کہ ٹھیک ہے، ان میں بعض پہلو فائدے کے بھی ہیں لیکن ان سے سوسائٹی کو جو نقصانات پہنچتے ہیں وہ ان کے فوائد سے کہیں زیادہ ہیں اس وجہ سے اخلاقی بہبود کے نقطۂ نظر سے یہ ناجائز ہیں۔ گویا قرآن نے یہاں اسلامی شریعت کا یہ مزاج بتا دیا کہ جن چیزوں کا نقصان ان کے نفع سے زائد

ہے وہ اس شریعت میں ممنوع ہیں۔

ایک غلط فہمی

بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ قرآن نے یہاں جوئے اور شراب کے جن فوائد و منافع کا اعتراف کیا ہے وہ ان کے مادی اور طبی منافع ہیں لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اوّل تو قرآن کو اشیا یا اعمال کے طبی و مادی فوائد سے براہ راست کوئی تعلق نہیں اور اگر کسی پہلو سے ہو بھی تو آخر دنیا میں کون سی بری سے بری اور ناپاک سے ناپاک چیز ہے جس کے اندر مضرت کے ساتھ کچھ پہلو فوائد کے نہ ہوں، پھر جوئے اور شراب ہی کی کیا خصوصیت ہے کہ قرآن نے ان کے ان فوائد کا اعتراف کیا؟ آخر چوری، زنا، سود اور خنزیر وغیرہ کے اندر جو بعض پہلو فوائد کے ہیں قرآن نے ان کا اظہار کیوں نہیں کیا۔

غلط فہمی کے وجوہ

ہمارے نزدیک اس ساری غلط فہمی کے سبب تین ہیں۔

ایک تو یہ کہ لوگوں نے اس جوئے اور شراب کو بالکل اس جوئے اور شراب پر قیاس کیا جس کا رواج ہماری سوسائٹی میں ہے اس وجہ سے وہ اس کے اندر کسی اخلاقی اور انسانی قدر کے پائے جانے کا تصور ہی نہیں کر سکے۔

دوسرا یہ کہ لوگوں کی نظر عام طور پر عرب جاہلیت کے کلام، ان کی روایات اور ان کے معروف و منکر پر بہت کم ہے اس وجہ سے قرآن کے ایسے اشارات تک مشکل ہی سے نگاہ پہنچتی ہے۔

تیسرا یہ کہ لوگ قرآن کے الفاظ پر بھی غور کرنے کا حق پورا پورا ادا نہیں کرتے سرسری طور پر جو بات سامنے آجاتی ہے اسی کو لے اُڑتے ہیں۔ دیکھیے یہاں آیت میں "نفع" کا مدِ مقابل لفظ "اثم" استعمال کر کے قرآن نے بالکل واضح کر دیا تھا کہ یہاں زیر بحث ان کے مادی اور طبی فوائد نہیں ہیں بلکہ اخلاقی فائدے ہیں اس لیے کہ اثم کا لفظ طبی نقصانات کے لیے نہیں استعمال ہوتا بلکہ اخلاقی مفاسد اور گناہوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اگر سوال شراب کے طبی نفع و نقصان سے متعلق ہوتا تو نفع کے مقابل میں "ضرر" کا لفظ استعمال ہوتا نہ کہ "اثم" کا۔

اس آیت نے اسلامی شریعت کا یہ مزاج واضح کر دیا کہ جو چیزیں اخلاقی اعتبار سے مضر ہیں، اگر ان سے کوئی فائدہ بظاہر بنی نوع انسان کو پہنچتا بھی ہو یا پہنچایا بھی جا سکتا ہو جب بھی ان کے ضرر کے پہلو کے غلبہ کے سبب سے اسلام میں ان سے احتراز ہی واجب ہے۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ کسی جگہ لوگ لاٹری ڈالیں تاکہ اس کی یافت سے ایک شاندار مسجد تعمیر کریں یا فلم اسٹاروں کا ایک امدادی شو منعقد کریں تاکہ اس کے ٹکٹ فروخت کر کے کسی مصیبت زدہ علاقے کے مسلمانوں کی مدد کریں۔ بظاہر یہ کام نیکی اور خدمتِ خلق کے ہیں لیکن اسلام نے اس نیکی کو جائز نہیں رکھا کیونکہ اس نیکی کے پردے میں جو بدی پرورش پاتی ہے وہ اس نیکی سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

جواب میں تدریج کی حکمت

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ

ایک ہی چیز سے متعلق اس بار بار کے سوال کا سبب میں واضح کر چکا ہوں کہ یہ سوالات ان کمزور قسم کے لوگوں

کی طرف سے ہیں جو انفاق میں مشقت محسوس کر رہے تھے۔ ان کی اسی کمزوری کا لحاظ تھا کہ قرآن نے ان کو جواب بھی درجہ بدرجہ دیا تاکہ ان پر زیادہ شاق نہ گزرے۔ دوا سے گھبرانے والے مریض کو اگر پوری خوراک ایک ہی مرتبہ میں نہ دی جا سکتی ہو تو تقاضائے حکمت یہی ہے کہ وہ دو تین مرتبہ میں دی جائے۔ چنانچہ انفاق کے متعلق بار بار سوال کرنے والوں کو بھی قرآن نے آخری اور فیصلہ کن جواب یہ تیسری مرتبہ میں دیا۔ یہ جواب اگر پہلی ہی مرتبہ میں دے دیا جاتا تو عجب نہیں کہ زیادہ کمزور قسم کے لوگوں کے ایمان کے لیے آزمائش بن جاتا۔

یہ جواب نہایت مختصر ہے مگر ساتھ ہی نہایت واضح اور قطعی ہے۔ فرمایا کہ قُلِ الْعَفْوَ (جو فاضل بچے وہ خرچ کرو) فاضل سے مراد ظاہر ہے کہ آدمی کی اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی ناگزیر ضروریات سے جو فاضل بچے وہ ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں وہ انفاق زیر بحث نہیں ہے جو عام مستحقین کے لیے صدقات واجبہ اور زکوٰۃ وغیرہ کی صورت میں ہر مسلمان پر ضروری ہے بلکہ یہ وہ انفاق ہے جس کا تعلق جہاد، اعلائے کلمۃ اللہ اور تحفظ و دفاع ملت سے ہے۔ ان مقاصد کے لیے ایک مسلمان پر انفاق کی جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کی یہ آخری حد بتادی گئی ہے کہ اگر ملت کی حفاظت و مدافعت کے لیے ضرورت پڑ جائے تو اپنی ناگزیر ضروریات سے جو فاضل بچا سکو وہ سب اس جہاد میں قربان کر دو۔ قومی زندگی میں ایسے حالات و واقعات بھی پیش آتے ہیں جب قوم و مذہب کے لیے سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے اور دنیا کی ہر غیرت مند قوم خواہ کافر ہو یا مومن، یہ بازی کھیلنے پر مجبور ہوتی ہے، اسلام نے یہ چاہا ہے کہ ہم اس قربانی و جاں بازی کے لیے اپنی خوشی سے تیار رہیں۔

"کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ" یہ اوپر کے پورے سوال و جواب پر تبصرہ ہے۔ ہم عرض کر آئے ہیں کہ یہ سارے سوالات انھی مسائل سے متعلق ہیں جو اشہر حرم، جہاد اور انفاق سے متعلق حج کے سلسلہ میں مذکور ہوئے تھے۔ انھی مسائل سے متعلق بعد میں کچھ مزید سوالات پیدا ہوئے تو ان کی وضاحت فرمائی اور بطور ذکر نعمت کے اشارہ فرمادیا کہ یہ اوپر کے اجمالات کی توضیح اور اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کی تکمیل ہے جو اس نے سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے کہ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَقُرْاٰنَہٗ، فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ، ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ (کہ ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا اور اس کا سنانا، تو جب ہم سنا چکیں تو اس سنانے کی پیروی کرو، پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی وضاحت)

یہاں اس تبیین کا فائدہ یہ بتایا ہے کہ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ تاکہ تم غور و فکر کرو۔ قرآن مجید نے مسائل کے بیان کرنے میں یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ ہر بات کے ہر پہلو کو ایک ہی ساتھ نہیں پیش کیا بلکہ ان کے بعض پہلوؤں کو مجمل چھوڑ دیا یہاں تک کہ جب ذہنوں میں ان سے متعلق سوالات پیدا ہوئے تو تدریج کے ساتھ ان کی وضاحت فرمائی، یہ محض اس لیے ہے کہ لوگوں کو غور و فکر کی تربیت حاصل ہو اور لوگ دین کے معاملات میں مجرد لکیر کے فقیر بن کر نہ رہیں بلکہ اس کے اسرار و رموز اور فوائد و مصالح تک پہنچنے کے لیے خود اپنی عقل بھی

استعمال کریں۔

ایک پرحکمت اضافہ

بظاہر تو یہ آیت تَتَفَكَّرُوْنَ پر ختم ہو جاتی ہے لیکن یہاں اس کے بعد فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ کا اضافہ بھی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اضافہ نہایت قیمتی ہے۔ اوپر کے سارے سوالات پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ سوالات جو پیدا ہوئے تو محض اس وجہ سے پیدا ہوئے کہ لوگوں کی نگاہوں میں عام طور پر وہ توازن نہیں ہوتا جو دین اور دنیا دونوں کے فوائد و مصالح کو صحیح صحیح تول سکے۔ اس عدم توازن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر دینداری کی طرف میلان ہوا تو لوگ دین کو نری رہبانیت بنا کے رکھ دیتے ہیں، یہاں تک کہ جنگ و جہاد خواہ کسی حالت میں بھی ہو، ان کے ہاں خلافِ تقویٰ قرار پا جاتا ہے اور اگر دنیاداری کی طرف میلان ہوگا تو جوئے اور شراب جیسی چیزوں کو بھی محض اس خیال کی بنا پر نیکی قرار دینے کی کوشش کریں گے کہ آخر ان میں بھی تو کچھ پہلو فائدے کے ہیں۔ قرآن نے فکرِ انسانی کی تربیت کی جو راہ اختیار کی ہے وہ اس عدم توازن کو دور کر کے اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں کا حق صحیح صحیح پہچان سکے۔

لفظ عفو سے اشتراکیت کا غلط استدلال

عَفْو کے لفظ سے اشتراکی نظریات سے متاثر لوگوں نے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ ناگزیر ضروریات سے فاضل آمدنی ایک اسلامی حکومت اجتماعی مقاصد کے لیے اپنے قبضہ میں لے سکتی ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اول تو یہاں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا تعلق حکومت سے نہیں بلکہ عام افراد سے ہے کہ وہ اپنی آزادیِ رائے سے اس حد تک ایثار کے لیے تیار ہیں، دوسرے یہ کہ اس چیز کا تعلق، جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، عام حالات سے نہیں ہے بلکہ ایمرجنسی کے حالات سے ہے جب ملت کے تحفظ کا سوال سامنے آن کھڑا ہو۔ ایسے حالات میں اول تو افراد خود ہی ہر طرح کی قربانیاں کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور اگر حکومت کوئی پابندی عائد کرنے کی ضرورت محسوس کرتی ہے تو اس میں بھی کوئی قباحت نہیں سمجھتے۔ اگرچہ اسلام کا حقیقی رجحان یہی ہے کہ افراد کی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان کے اندر ارادہ و اختیار کی آزادی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ نیکی کرنے کا حوصلہ پیدا ہو۔ اسلام کی نظر میں اس آزادی کی جتنی قدر ہے، اتنی قدر مجبوری اور پابندی کی نیکی کی نہیں ہے۔

فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَيَسْــَٔـلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّھُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲۲۰)

یتیموں کے بارے میں مسلم معاشرہ کی ذمہ داری

یتامیٰ سے متعلق یہ سوال بھی اس معاشرتی خدمت و تعاون کے تعلق سے پیدا ہوا جس کی ہدایت آیت ۲۱۵ میں دی گئی ہے۔ اسلام نے جب ہر شخص پر اس کے والدین و اقربا کے ساتھ ساتھ یتامیٰ اور خاص کر خاندان کے یتامیٰ کی ذمہ داری بھی ڈالی کہ اگر وہ محتاج و بے وسیلہ ہوں تو ان پر خرچ کرو اور اگر ان کے پاس مال ہو تو پوری احتیاط کے ساتھ (حتی الامکان بلا معاوضہ) اس کی نگرانی اور اس کو نشو و نما دینے کی کوشش کرو تو لوگوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر ایک شخص انتظامی سہولت کے پیشِ نظر کسی یتیم کے مال یا اس

کے کاروبار کو اپنے مال اور کاروبار میں شامل کر لے اور اس کے حقوق کی حفاظت کے پہلو سے ایسے یتیم کی ماں سے نکاح کر لے تو اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟ یہ سوال خاص طور پر اس وجہ سے پیدا ہوا کہ اسلام نے یتیموں کے حقوق اور ان کے مال کے تحفظ سے متعلق جن احتیاطوں کی تاکید فرمائی ہے وہ بڑی ہی سخت ہیں۔ قرآن میں صاف ارشاد ہے کہ نیک مقصد کے سوا یتیموں کے مال کے پاس بھی نہ پھٹکو، یہ بھی تنبیہ ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ بھرتے ہیں، ایک متقی آدمی ان تنبیہات کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کی اجازت کے بغیر یہ جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ یتیموں کے معاملات اور اپنے معاملات کو یکجا کر سکے۔

اس سوال کے جواب میں قرآن نے اصولی بات جو فرمائی وہ یہ ہے کہ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ اصل مقصود یہ ہے کہ ہر پہلو سے یتیموں کی بہبود پیش نظر رہے۔ جس چیز میں ان کی بہتری ہو وہی بہتر ہے۔ اگر تمھارے حالات کے لحاظ سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ ان کے معاملات الگ رکھ کر ان کی دیکھ بھال کرو تو ایسا کرو، اور اگر محسوس کرو کہ اپنے ساتھ شامل کر کے زیادہ بہتر طریقہ سے یہ فرض انجام دے سکتے ہو تو تمھیں اس کی بھی اجازت دی جاتی ہے، آخر وہ تمھارے اپنے ہی بھائی بند تو ہیں، پھر علیحدگی کیوں لازم قرار دی جائے؟ لیکن اس اجازت کے ساتھ یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ یعنی ہر شخص یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ اس اشتراک سے کس کے پیش نظر یتیم کی بہبود ہے اور کس کے پیش نظر اس پردے میں اس کے مال کو ہڑپ کرنا، اگر کسی نے اس اجازت سے غلط فائدہ اٹھایا تو وہ یاد رکھے کہ خدا عزیز و حکیم ہے، کوئی اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکے گا۔ ساتھ ہی اس احسان کی طرف بھی توجہ دلا دی کہ یہ محض اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اس نے تمھاری سہولت کے پیش نظر تمھیں اس قسم کے اشتراک کی اجازت دے دی ورنہ یہ عین ممکن تھا کہ وہ تمھیں اس اشتراک سے روک دیتا اور ساتھ ہی یہ حکم دے دیتا کہ یتیم کے مال یا جائداد کی حفاظت کرو۔ اگر ایسا ہوتا تو تم ایک بڑی مشقت میں پڑ جاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے تم پر بڑا کرم فرمایا کہ اس نے بغیر کسی مشقت میں ڈالے تمھارے لیے خدمت اور نیکی کی ایک راہ کھولی تو تم میں سے ہر شخص خدا کے اس احسان کا شکر گزار ہو اور اس اجازت سے کوئی غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔

'عنت' کا مفہوم اور اسلامی شریعت کا مزاج

'عَنَتٌ' کے معنی زحمت اور مشقت کے ہیں اور 'اعنات' کے معنی مشقت میں ڈالنے کے ہیں۔ اس سے اسلامی شریعت کا مزاج معلوم ہوتا ہے کہ اس شریعت نے مشقت میں ڈالنے کی نہیں بلکہ مشقتوں سے بچانے کی راہیں کھولی ہیں۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ښ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۲۲۱)

مشرکات سے نکاح کی ممانعت

اوپر یتیموں کی بہبود کے پہلو سے جس اشتراک کی اجازت دی گئی ہے اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر کسی یتیم کا ولی، یتیم کے حقوق ہی کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے یہ مناسب خیال کرے کہ اس یتیم کی ماں سے نکاح کر لے تاکہ اس طرح ایک بیوہ کی پرورش اور اس کی حفاظت و عصمت کا انتظام بھی ہو جائے اور یتیم کے حقوق کی نگہداشت کے لیے اس کے گھر میں ایک بیدار نگاہ رکھنے والی بھی آجائے تو اس کا حکم کیا ہے؟ قرآن نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ مصلحت بجائے خود اہمیت رکھنے والی ہے اور اس کو پیشِ نظر رکھ کر یتامیٰ کی ماؤں سے نکاح کیا جا سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ مومنہ ہوں، یہ شرط اس وجہ سے لگائی ہے کہ اس وقت تک صورتِ حال یہ تھی کہ بہت سے ایسے یتیم بھی تھے جن کی مائیں اسلام میں داخل نہیں ہوئی تھیں اس وجہ سے یہ ہدایت ہوئی کہ اس مصلحت کی خاطر بھی مشرکات سے نکاح کی اجازت بہر حال نہیں ہے کیونکہ اس سے دوسرے مفاسد کے پیدا ہونے کے اندیشے ہیں جن کی طرف آگے اشارہ فرمایا ہے۔

مشرکین اور مشرکات کا استعمال بطور اصطلاح

یہ امر ملحوظ رہے کہ مشرکین اور مشرکات کا لفظ قرآن میں خاص عرب کے مشرکین اور مشرکات کے لیے بطورِ لقب یا عَلَم کے استعمال ہوا ہے، دوسری قومیں جن میں شرک پایا جاتا ہے، خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشابہ اہل کتاب ہیں سے، وہ براہ راست اس لفظ کے تحت نہیں ہیں اس وجہ سے ان کے احکام کی تفصیل اپنی جگہ پر آئے گی۔

پسند اور ناپسند کے لیے اسلامی معیار

یہاں بنی اسماعیل کے مشرکین اور مشرکات سے متعلق یہ وضاحت فرما دی کہ نہ ان کی عورتوں کو اپنے نکاح میں لینا تمھارے لیے جائز ہے اور نہ اپنی لڑکیاں ان کو دینا جائز ہے۔ اس ممانعت کے ساتھ یہ وضاحت بھی بڑی تاکید کے ساتھ فرما دی کہ ایک مسلمان لونڈی ایک آزاد مشرکہ پر ترجیح رکھتی ہے اگرچہ وہ تمھیں کتنی ہی دلکش معلوم ہو، اسی طرح ایک غلام مومن ایک آزاد مشرک پر ترجیح رکھتا ہے، اگرچہ وہ تمھیں کتنا ہی بھلا لگتا ہو۔ پھر اس کی وجہ بتا دی کہ اسلام میں پسند اور ناپسند کے لیے معیار نہ ظاہری شکل و صورت ہے، نہ نسل و نسب اور نہ آزادی اور غلامی بلکہ ایمان اور عمل صالح ہے۔ اس وجہ سے اب تمھارے رشتے ناتے ذاتوں اور برادریوں کے پابند نہیں رہ گئے بلکہ عقیدے اور عمل کے تابع ہو گئے ہیں۔ قریش کی ایک مہ جبین شہزادی تمھارے لیے دو کوڑی کی ہے اگر وہ ایمان کے زیور سے آراستہ نہیں ہے اور سواحل افریقہ کی ایک کالی کلوٹی لونڈی تمھارے لیے حورِ جنت ہے اگر اس کا دل جمالِ ایمان و اسلام سے نورانی ہے۔ اسی طرح تمھارے لیے یہ بات تو جائز ہے کہ تم اپنی لڑکی کا ہاتھ ایک غلام زادہ کے ہاتھ میں پکڑا دو اگر وہ دولتِ ایمان رکھتا ہے اور قریش کے ایک صاحبِ شوکت سردار کو بھی اپنی لڑکی دینے سے انکار کر دو اگر وہ ایمان و اسلام سے محروم ہے۔

زندگی پر رشتے ناتے کے اثرات

پھر اس کا فلسفہ بتایا کہ رشتے ناتے کے اثرات زندگی پر سطحی اور سرسری نہیں ہوتے بلکہ بڑے گہرے ہوتے ہوتے ہیں، اگر آدمی ان چیزوں میں عقائد و اعمال کو کوئی اہمیت نہ دے، صرف حسن، یا مال، یا خاندان یا مصلحت ہی کو سامنے رکھے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ہی خرچ پر اپنے گھر میں ایک ایسی بلا پال لے جو صرف اسی کے نہیں بلکہ اس کی آئندہ نسلوں کے ایمان و اسلام کا بیج بھی مار دے۔ شادی بیاہ کے تعلقات تے مذہب، روایات

اور تہذیب و تمدن میں جو عظیم تبدیلیاں کی ہیں اس کی عملی مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر بے شمار عقائدی گمراہیاں ان عورتوں کے ذریعہ سے پھیلیں جو وہ دوسری بت پرست قوموں میں سے بیاہ کے لائے۔ اسی طرح ہمارے ہاں مغل سلاطین نے ہندو راجاؤں کے ہاں سیاسی مصالح کے تحت جو شادیاں کیں تو ان کی لڑکیوں کے ساتھ ساتھ ان کے عقائد، اوہام، رسوم اور عبادت کے طریقے بھی اپنے گھروں میں گھسا لائے۔ آج بھی جو لوگ قوموں اور مذہبوں کے امتیازی نشانات و نظریات کو ختم کرنے کے درپے ہیں وہ اس کا سب سے زیادہ کارگر نسخہ آپس کی شادیوں ہی کو سمجھتے ہیں اس وجہ سے ایک مسلمان کو اس معاملے میں بے پروا اور سہل انگار نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس عظیم حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ جس رب پر وہ ایمان رکھتا ہے اس کی دعوت مغفرت اور جنت کی طرف ہے اور جو لوگ اس ایمان سے محروم ہیں وہ دوزخ کی طرف رہنمائی کرنے والے ہیں، عام اس سے کہ عورت ہوں یا مرد۔

یہ آیت بھی چونکہ اوپر کے مباحث کی وضاحت کے طور پر نازل ہوئی ہے اس وجہ سے آخر میں فرما دیا کہ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۔ اور اللہ اپنی آیتوں کی وضاحت کر رہا ہے تاکہ لوگ یاددہانی حاصل کریں۔

اوپر کی دو آیتوں میں یتامیٰ سے متعلق جو باتیں کہی گئی ہیں سورۂ نساء میں بھی ان کی طرف اشارے ہیں۔ ہم متعلق آیات یہاں نقل کیے دیتے ہیں تاکہ دونوں کو سامنے رکھنے سے ہر پہلو واضح ہو جائے۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝ وَاٰتُوا النِّسَاۗءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۭ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْۗـــــًٔـا مَّرِيْۗـــــًٔـا ۝ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاۗءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْھُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْھُمْ وَقُوْلُوْا لَھُمْ قَوْلًا

اور یتیموں کا مال ان کے حوالہ کرو اور ان کے اچھے مال کے بدلے اپنا برا مال نہ دو اور ان کے مالوں کو اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ، یہ بہت بڑا گناہ ہے اور اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ یتیموں کے ساتھ کما حقہٗ انصاف نہ کر سکو گے تو جو راضی ہوں عورتوں میں سے ان سے نکاح کر لو، دو دو، تین تین، چار چار تک۔ اگر یہ اندیشہ ہو کہ عورتوں میں عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی پر قناعت کرو، یا پھر جو تمھاری لونڈیاں ہوں، اور یہ زیادہ اس بات کے قرین ہے کہ تم عدل سے نہ ہٹو۔ اور ان عورتوں کو راضی خوشی ان کے مہر دو، اگر وہ اس کا کوئی حصہ تمھارے لیے بخوشی چھوڑ دیں تو اس کو باطمینان اپنے تصرف میں لاؤ اور بے وقوف یا نادان بچوں کو اپنا وہ مال حوالہ نہ کرو جو خدا نے تمھاری قیام معیشت کا ذریعہ بنایا ہے، البتہ اس میں ان کو کشادگی

مَّعۡرُوۡفًا ۝ وَابۡتَلُوا الۡيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا	کے ساتھ کھلاؤ پہناؤ اور ان کو تسلی دیتے رہو اور یتیموں
النِّكَاحَ ۚ فَاِنۡ اٰنَسۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ رُشۡدًا	کو جانچتے رہو، جب وہ شادی کی عمر کو پہنچ جائیں تو اگر تم
فَادۡفَعُوۡۤا اِلَيۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ ۚ وَلَا تَاۡكُلُوۡهَاۤ	ان میں معاملات کی سوجھ بوجھ پاؤ تو ان کا مال ان کے حوالہ
اِسۡرَافًا وَّبِدَارًا اَنۡ يَّكۡبَرُوۡا ؕ وَ	کرو اور فضول خرچی اور جلد بازی کے ساتھ کہیں وہ بڑے
مَنۡ كَانَ غَنِيًّا فَلۡيَسۡتَعۡفِفۡ ۚ وَمَنۡ	ہو جائیں ان کا مال ہڑپ نہ کرو۔ جو غنی ہو تو چاہیے کہ
كَانَ فَقِيۡرًا فَلۡيَاۡكُلۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ	وہ احتراز کرے اور جو محتاج ہو تو وہ دستور کے مطابق اس
فَاِذَا دَفَعۡتُمۡ اِلَيۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ	میں سے لے، پھر جب تم ان کا مال ان کے حوالہ کرنے
فَاَشۡهِدُوۡا عَلَيۡهِمۡ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ	لگو تو ان پر گواہ ٹھہرا لو، ویسے اللہ حساب لینے کے
حَسِيۡبًا (۶-۷ نساء)	لیے کافی ہے۔

۷۲۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۲۲۲-۲۳۱

اوپر آپ نے دیکھا کہ کس طرح حج کے تعلق سے جہاد، جہاد کے تعلق سے انفاق، انفاق کے تعلق سے جوئے اور شراب اور ساتھ ہی یتامیٰ کی ہمدردی کے مسائل یکے بعد دیگرے پیدا ہو گئے۔ اسی طرح یتامیٰ کی ماؤں کے ساتھ نکاح کے مسئلہ نے ایک طرف تو طلاق و نکاح سے متعلق بعض مناسب وقت مسائل کے بیان کے لیے تقریب پیدا کر دی اور دوسری طرف عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے تقاضے سے بعض احکام و ہدایات کے نزول کے لیے نہایت سازگار فضا پیدا ہو گئی اور قرآن مجید کا طریقہ یہی ہے کہ جب ایک بات کے بیان کے لیے موزوں حالات پیدا ہو گئے ہیں تو بارش کی طرح کلام ایک وسیع دائرے میں برس گیا ہے چنانچہ یہاں بھی متعلق مسائل کا ایک نہایت اہم حصہ بیان ہو گیا ہے۔ ان مسائل کا آغاز ایام ماہواری سے متعلق ایک سوال کے جواب سے ہوا ہے۔ اس خاص سوال کی اہمیت اس سلسلے میں یہ ہے کہ نکاح و طلاق کے بہت سے مسائل کی، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہو گا، یہی چیز حد بندی کرتی ہے اس وجہ سے اصل مسائل سے پہلے خود اس چیز سے متعلق شریعت کے احکام و ہدایات کا جاننا نہایت ضروری تھا۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۲۲-۲۳۱

وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡمَحِيۡضِ ؕ قُلۡ هُوَ اَذًى ۙ فَاعۡتَزِلُوا النِّسَآءَ فِى الۡمَحِيۡضِ ۙ وَلَا تَقۡرَبُوۡهُنَّ حَتّٰى يَطۡهُرۡنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرۡنَ فَاۡتُوۡهُنَّ مِنۡ حَيۡثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيۡنَ وَ

يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ
اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ
مُّلٰقُوْهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ
اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ
يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ
يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾
وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ وَلَا يَحِلُّ
لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ
اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ
وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾ اَلطَّلَاقُ ع
مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ
لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا
يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا
تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا
غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ
ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۗ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ
يَعْلَمُونَ ﴿۲۳۰﴾ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ
بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِتَعْتَدُوا ۚ
وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ
هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ
الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۲۳۱﴾ ع

۲۹ ۱۰ ع ۱۲

ترجمۂ آیات ۲۲۲-۲۳۱

اور وہ تم سے حیض کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو، یہ ناپاکی ہے تو عورتوں سے
حیض کے دنوں میں الگ رہو، اور ان سے قربت نہ کرو جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں۔
پس جب وہ صفائی کر لیں تو ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تم کو حکم دیا ہے، اللہ
توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔
عورتیں تمہارے لیے بمنزلہ کھیتی ہیں تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ، اور اپنے
لیے آگے بڑھاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ تمہیں اس سے لازماً ملنا
ہے اور ایمان والوں کو خوشخبری دے دو۔ ۲۲۲-۲۲۳

اور اللہ کو اپنی ایسی قسموں کا ہدف نہ بناؤ کہ احسان نہ کرو گے یا حدودِ الٰہی کا احترام نہ
کرو گے یا لوگوں کے درمیان صلح نہ کراؤ گے، اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اللہ تم سے

تمھاری عادی قسموں کے باب میں تو کوئی مواخذہ نہیں کرے گا لیکن ان قسموں کے باب میں تم سے ضرور مواخذہ کرے گا جو تمھارے دل کے ارادے کا نتیجہ ہیں اور اللہ بخشنے والا اور حلیم ہے جو لوگ اپنی بیویوں سے نہ ملنے کی قسم کھا بیٹھیں ان کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے۔ اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا، مہربان ہے اور اگر طلاق کا فیصلہ کر لیں تو اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۲۲۴-۲۲۷

اور مطلقہ عورتیں اپنے بارے میں تین حیض تک توقف کریں، اور اگر وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحموں میں جو کچھ پیدا کیا ہے اس کو چھپائیں۔ اور اس دوران میں ان کے شوہر ان کے لوٹانے کے زیادہ حق دار ہیں، اگر وہ سازگاری کے طالب ہیں اور ان عورتوں کے لیے دستور کے مطابق اسی طرح حقوق ہیں جس طرح دستور کے مطابق ان پر ذمہ داریاں ہیں، ہاں مردوں کے لیے ان پر ایک درجہ ترجیح کا ہے اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ ۲۲۸۔

طلاق دو مرتبہ ہے۔ پھر دستور کے مطابق یا تو روک لینا ہے یا احسان کے ساتھ رخصت کر دینا ہے، اور تمھارے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ تم نے جو کچھ ان عورتوں کو دیا ہے اس میں سے کچھ واپس لو مگر اس صورت میں کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ حدودِ الٰہی کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ پس اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ وہ دونوں حدودِ الٰہی پر قائم نہیں رہ سکتے تو ان پر اس چیز کے باب میں کوئی گناہ نہیں ہے جو عورت فدیہ میں دے، یہ اللہ کے حدود ہیں تو ان سے تجاوز نہ کرو اور جو اللہ کے حدود سے تجاوز کرتے ہیں تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ پس اگر وہ اس کو طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے بعد اس کے لیے جائز

نہیں ہے تا آنکہ وہ اس کے سوا کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے۔ پس اگر وہ اس کو طلاق دے دے تو پھر ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ مراجعت کرلیں، اگر یہ توقع رکھتے ہوں کہ وہ اللہ کے حدود پر قائم رہ سکتے ہیں، یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں، وہ ان کو واضح کر رہا ہے، ان لوگوں کے لیے جو علم کے طالب ہیں۔ ۲۲۹-۲۳۰

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ پہنچ جائیں اپنی مدت کو تو ان کو دستور کے مطابق روک لو یا دستور کے مطابق رخصت کر دو اور تم ان کو نقصان پہنچانے کے ارادے سے نہ روکو کہ تم حدود سے تجاوز کرو اور جو ایسا کرے گا تو وہ اپنی ہی جان پر ظلم ڈھائے گا اور اللہ کی آیات کو مذاق نہ بناؤ اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد رکھو اور اس کتاب و حکمت کو یاد رکھو جو اس نے تمہاری نصیحت کے لیے اتاری اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ ۲۳۱

۷۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّـوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (۲۲۲)

ایامِ حیض کے احکام

ایام ماہواری سے متعلق یہ سوال صرف اسی پہلو سے نہیں پیدا ہوا کہ اس زمانے میں عورت سے قربت جائز ہے یا نہیں، اس زمانے میں قربت تو نہ صرف تمام آسمانی مذاہب میں ممنوع رہی ہے بلکہ عرب جاہلیت بھی اس کو ناجائز سمجھتے تھے، ان کے اشعار میں مختلف پہلوؤں سے اس کا ذکر ملتا ہے۔ البتہ اس سے متعلق دوسرے بہت سے مسائل تھے، جن میں بڑی افراط و تفریط پائی جاتی تھی مثلاً یہ کہ اس زمانے میں عورت سے اجتناب کے حدود کیا ہیں، اس کے لیے طہارت کے کیا آداب و شرائط ہیں اور طلاق و عدت وغیرہ کے معاملات میں اس کی اہمیت کیا ہے؟ بالخصوص موخر الذکر سوال کی بڑی اہمیت تھی اس لیے کہ اس کے اثرات نکاح، طلاق، عدت، وراثت اور دوسرے تقریباً تمام عائلی مسائل پر پڑتے تھے اس وجہ سے نکاح و طلاق کی اس

بحث میں قرآن نے سب سے پہلے اسی سوال کو لیا اور اس کا جواب دیا۔

علیحدگی کی حد

اس زمانے میں عورت سے علیحدہ رہنے (اعتزال) کا جو حکم دیا ہے اس کی صحیح حد آگے کے الفاظ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ (اور تم ان سے قربت نہ کرو یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں تو جب وہ پاکیزگی حاصل کرلیں تو ان کے پاس آؤ جہاں سے اللہ نے تم کو حکم دیا ہے) سے خود واضح ہو رہی ہے کہ یہ علیحدگی صرف زن و شو کے خاص تعلق کے حد تک ہی مطلوب ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ عورت کو بالکل اچھوت بنا کے رکھ دو، جیسا کہ دوسرے مذاہب میں ہے۔ اس چیز کی وضاحت احادیث اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی ہوئی ہے۔

اس آیت میں 'طہر' اور 'تطہر' دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ طہر کے معنی تو یہ ہیں کہ عورت کی ناپاکی کی حالت ختم ہو جائے اور خون کا آنا بند ہو جائے اور 'تطہر' کے معنی یہ ہیں کہ عورت نہا دھو کر پاکیزگی کی حالت میں آجائے۔ آیت میں عورت سے قربت کے لیے طہر کو شرط قرار دیا ہے اور ساتھ ہی فرما دیا ہے کہ جب وہ پاکیزگی حاصل کرلیں تب ان کے پاس آؤ جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ چونکہ قربت کی ممانعت کی اصلی علت خون ہے اس وجہ سے اس کے انقطاع کے بعد یہ پابندی تو اٹھ جاتی ہے لیکن صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب عورت نہا دھو کر پاکیزگی حاصل کرلے تب اس سے ملاقات کرو۔

تمام بدیہیات فطرت شریعت کے اجزا ہیں

"فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ" (تو ان کے پاس آؤ، جہاں سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے) سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تمام بدیہیات فطرت اللہ کے اوامر میں شامل ہیں اور اس پہلو سے وہ شریعت الٰہی کے اجزا ہیں اگرچہ لفظوں میں خدا کی طرف سے ان کا حکم دیا گیا ہو یا نہ دیا گیا ہو۔ مثلاً یہ کہ اگرچہ اس بات کا کہیں حکم نہیں دیا گیا ہے کہ لقمہ منہ میں ہی ڈالنا چاہیے، ناک یا آنکھ میں نہیں ڈالنا چاہیے تاہم یہ خدا کا حکم ہے اس لیے کہ فاطر نے ہماری فطرت یہی بنائی ہے، اگر کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کرے تو درحقیقت وہ خدا کے ایک واضح بلکہ واضح تر حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے اور اس پر وہ خدا کے ہاں سزا کا مستحق ہوگا۔ ہم نے اس کو واضح کے بجائے واضح تر اس لیے قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے معاملات کو صرف اس وجہ سے ہماری فطرت پر چھوڑ دیا ہے کہ فطرت ان کی وضاحت کی وجہ سے ان میں کسی رہنمائی کی محتاج نہیں تھی۔ بعینہٖ یہی معاملہ محل مباشرت کا ہے، اگر کوئی شخص اس میں اندھے پن کا ثبوت دیتا ہے تو وہ حیوانات سے بھی گیا گزرا ہے اس لیے کہ وہ اس میں کوئی غلطی نہیں کرتے اگرچہ وہ کسی قرآن اور کتاب سے آشنا نہیں ہیں۔

'توبہ' اور 'تطہر' کی حقیقت

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ۔ توبہ اور تطہر کی حقیقت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ توبہ اپنے باطن کو گناہوں سے پاک کرنے کا نام ہے اور تطہر اپنے ظاہر کو نجاستوں اور گندگیوں سے پاک کرنا ہے اس اعتبار سے ان دونوں کی حقیقت ایک ہوئی اور مومن کی یہ دونوں خصلتیں اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں اس کے برعکس جو لوگ ان سے محروم ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہیں۔ یہاں جس سیاق میں یہ بات

آئی ہے اس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ جو لوگ عورت کی ناپاکی کے زمانے میں قربت سے اجتناب نہیں کرتے یا تقاضائے شہوت کے معاملے میں فطرت کے حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ اللہ کے نزدیک نہایت مبغوض ہیں۔ احادیث میں اس بات کی وضاحت موجود ہے۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُم مُّلَاقُوهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ (۲۲۳)

"حرث" کے معنی عربی میں کھیتی کے ہیں، عام اس سے کہ وہ باغوں کی نوعیت کی ہو یا دوسری فصلوں کی۔

عورت کے لیے کھیتی کا استعارہ

عورتوں کے لیے کھیتی کے استعارہ میں ایک سیدھا سادا پہلو تو یہ ہے کہ جس طرح کھیتی کے لیے قدرت کا بنایا ہوا یہ ضابطہ ہے کہ تخم ریزی ٹھیک موسم میں اور مناسب وقت پر کی جاتی ہے، نیز بیج کھیت ہی میں ڈالے جاتے ہیں کھیت سے باہر نہیں پھینکے جاتے، کوئی کسان اس ضابطے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، اسی طرح عورت کے لیے فطرت کا یہ ضابطہ ہے کہ ایام ماہواری کے زمانے میں یا کسی غیر محل میں اس سے تقاضائے شہوت نہ کی جائے اس لیے کہ حیض کا زمانہ عورت کے جمام اور غیر آمادگی کا زمانہ ہوتا ہے، اور غیر محل میں مباشرت باعث اذیت و اضاعت ہے۔ اس وجہ سے کسی سلیم الفطرت انسان کے لیے اس کا ارتکاب جائز نہیں۔ اپنے اس پہلو سے یہ آیت اوپر والی آیت کی گویا توضیح مزید ہوئی۔

آزادی اور پابندی کے حدود

"فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ" (پس اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ) میں بیک وقت دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو اس آزادی، بے تکلفی، خود مختاری کی طرف جو ایک باغ یا کھیتی کے مالک کو اپنے باغ یا کھیتی کے معاملے میں حاصل ہوتی ہے اور دوسری اس پابندی، ذمہ داری اور احتیاط کی طرف جو ایک باغ یا کھیتی والا اپنے باغ یا کھیتی کے معاملے میں ملحوظ رکھتا ہے۔ اس دوسری چیز کی طرف "حرث" کا لفظ اشارہ کر رہا ہے اور پہلی چیز کی طرف أَنَّىٰ شِئْتُمْ کے الفاظ۔ وہ آزادی اور یہ پابندی، یہ دونوں چیزیں مل کر اس رویہ کو متعین کرتی ہیں جو ایک شوہر کو بیوی کے معاملہ میں اختیار کرنا چاہیے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ازدواجی زندگی کا سارا سکون و سرور فریقین کے اس اطمینان میں ہے کہ ان کی خلوت کی آزادیوں پر فطرت کے چند موٹے موٹے قیود کے سوا کوئی قید، کوئی پابندی اور کوئی نگرانی نہیں ہے۔ آزادی کے اس احساس میں بڑا کیف اور بڑا نشہ ہے۔ انسان جب اپنے عیش و سرور کے اس باغ میں داخل ہوتا ہے تو قدرت چاہتی ہے کہ وہ اپنے اس نشہ سے سرشار ہو لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس کے سامنے قدرت نے رکھ دی ہے کہ یہ کوئی جنگل نہیں بلکہ اس کا اپنا باغ ہے اور یہ کوئی ویرانہ نہیں بلکہ اس کی اپنی کھیتی ہے، اس وجہ سے وہ اس میں آنے کو تو سو بار آئے اور جس شان، جس آن، جس سمت اور جس پہلو سے چاہے آئے لیکن اس باغ کا باغ ہونا اور کھیتی کا کھیتی ہونا یاد رکھے، اس کے کسی آنے میں بھی اس حقیقت سے غفلت نہ ہو۔ اپنی کھیتی سے متعلق ہر کسان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس سے اسے برابر نہایت اچھی فصل حاصل

ہوتی رہے، مناسب وقت پر اس میں ہل چلتے رہیں، ضرورت کے مطابق اس کو کھاد اور پانی ملتا رہے، موسمی آفتوں سے وہ محفوظ رہے، آئندہ و روند، چرند و پرند اور دشمن اور چور اس کو نقصان نہ پہنچا سکیں، جب وہ اس کو دیکھے تو اس کی طراوت و شادابی اس کو خوش کر دے اور جب وقت آئے تو وہ اپنے پھلوں اور پھولوں سے اس کا دامن بھر دے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے نظریے کی تردید

قرآن نے عورت کے لیے کھیتی کے استعارے میں یہ ساری باتیں جمع کر دی ہیں اور اس استعارے نے ان لوگوں کے نظریے کی تو جڑ ہی کاٹ دی ہے جو خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیمیں چلاتے ہیں۔ اس لیے کہ کھیتی سے متعلق یہ رہنمائی تو معقول قرار دی جا سکتی ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ اور اچھی سے اچھی پیداوار کس طرح حاصل کی جائے لیکن یہ بات بالکل غیر منطقی ہے کہ لوگوں کو اس بات کے سبق پڑھائے جائیں کہ وہ بیج تو زیادہ سے زیادہ ڈالیں لیکن فصل کم سے کم حاصل کریں۔ اس قسم کی نامعقول منطق صرف نادانوں ہی کو سوجھ سکتی ہے۔

'وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ' (اور اپنے لیے آگے بڑھاؤ) کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح زمین کی کھیتی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے تم اپنے مستقبل کی معاش کا انتظام کرو اسی طرح عورت کی کھیتی کی اصلی غایت یہ ہے کہ اس سے تم نسلِ انسانی کے مستقبل میں اپنی جگہ محفوظ اور اس کے قیام و بقا میں اپنا حصہ ادا کر سکو۔ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ، کے بعد ان الفاظ کے اضافے نے یہ حقیقت نہایت واضح الفاظ میں سامنے رکھ دی کہ عورت سے مواصلت کی اصل غایت بقائے نسل ہے، لذت اس کا صرف ضمنی فائدہ ہے اس وجہ سے ہر وہ طریقہ جو اس مقصد کو ضائع کرنے والا یا اس کو نقصان پہنچانے والا ہو اگرچہ لذت کے تقاضے اس سے پورے ہو جاتے ہیں، فاطر کی بنائی ہوئی فطرت اور اس کے تقاضوں کے بالکل خلاف ہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ انسان جس طرح اپنی اولاد کے ذریعہ سے نسلِ انسانی کے اندر اپنا ایک مقام محفوظ کرتا ہے اسی طرح ان کے ذریعہ سے اگر وہ ان کی اچھی تربیت کر سکے، آخرت میں بھی اپنے سرمائے میں برابر اضافہ کرتا رہتا ہے اس لیے کہ اولاد صالح کی نیکی ایک خیر جاری ہے جس کا سلسلہ آدمی کی موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ احادیث میں اس کی دلیل موجود ہے۔ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ میں یہ دونوں ہی پہلو موجود ہیں۔

بعض اہل تاویل نے اس کی تاویل اس سے مختلف کی ہے لیکن ہمارے نزدیک یہی تاویل صحیح ہے۔ قرآن کے نظائر سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ اسی سورہ میں، دوسری جگہ اس طرح وارد ہے فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۱۸۷۔ بقرۃ (پس اب تم ان سے مباشرت کرو، اور وہ چیز چاہو جو اللہ نے تمہارے لیے مقدر کی ہے) اس آیت کی تاویل اوپر گزر چکی ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ (اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ بالآخر تمہیں اس سے ملنا ہے) کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ تم فطرت کے ان قوانین اور اللہ کے ان حدود کو آج خلوت میں بھی اور جلوت

ہیں بھی توڑ سکتے ہو اور تمھیں اس کی مہلت ملی ہوئی ہے لیکن یاد رکھو کہ ایک دن تمھیں خدا کو بھی منہ دکھانا ہے جس کی آنکھیں تمھیں ہر جگہ دیکھ رہی ہیں اور جس کی پکڑ سے تمھیں کوئی بھی نہ بچا سکے گا۔ اس دھمکی کے ساتھ ان اہل ایمان کو بشارت بھی دے دی جو نفس کی تمام ترغیبات کے باوجود اس امر کو یاد رکھتے ہیں کہ ایک دن انھیں اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۲۴)

اللہ کو قسموں کا ہدف بنانے کا مطلب

"عُرْضَةٌ" کے معنی ہدف اور نشانہ کے ہیں۔ اللہ کو قسموں کا ہدف بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نام پر بے ضرورت اور لایعنی قسمیں یا ایسی قسمیں کھائی جائیں جو نیکی و تقویٰ اور مقصد اصلاح کے خلاف ہوں۔ خدا کے عظیم نام کو لایعنی قسموں کے لیے استعمال کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص مچھر مارنے کے لیے توپ داغتا پھرے اور نیکی اور تقویٰ کے خلاف قسموں کے لیے اس کے پاک نام کو استعمال کرنا گویا اسی کے نام سے نیکی اور تقویٰ کی جڑ کاٹنا ہے جو تمام نیکی اور تمام خیر کا سرچشمہ ہے۔

عربی زبان میں "اَنْ" سے پہلے بعض حالات میں مضاف اور بعض مواقع میں اس کے بعد حرف "لا" کو حذف کر دیتے ہیں۔ اس محذوف کو سیاق و سباق سے سمجھتے ہیں۔ یہاں واضح قرینہ ہے کہ "اَنْ" کے بعد "لا" محذوف ہے۔ قرآن میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ استاذ امامؒ نے اس کے شواہد اپنی کتاب الاسالیب میں جمع کر دیے ہیں۔

'بِرّ' تقویٰ اور اصلاح سے مراد

بِرّ، تقویٰ اور اصلاح کے تینوں لفظوں نے یہاں خیر اور نیکی کے تمام اقسام کو جمع کر لیا ہے۔ "بِرّ" ان تمام نیکیوں پر حاوی ہے جن کا تعلق والدین، رشتہ داروں، مسکینوں، یتیموں اور دوسرے حقوق العباد سے ہے۔ "تقویٰ" ان نیکیوں پر حاوی ہے جو حقوق اللہ سے متعلق ہیں اور "اصلاح" سے مراد وہ نیکیاں ہیں جو معاشرہ سے تعلق رکھنے والی ہیں۔

آیت ۲۲۴ کے مسائل کی تمہید ہے

یہ آیت آگے بیان ہونے والے مسائل کی تمہید ہے۔ آگے ایلاء کا اور اس کے بعد نکاح و طلاق سے متعلق بعض اہم مسائل کا ذکر آ رہا ہے۔ ایلاء اس قسم کو کہتے ہیں جو کوئی شخص بیوی سے ازدواجی تعلق نہ رکھنے کے لیے کھا بیٹھے۔ قسم چونکہ تمام معاشرتی، سماجی اور سیاسی معاملات و معاہدات میں اعتماد و استحکام کا ذریعہ ہے اور اس سے تمدن کے نہایت اعلیٰ مقاصد پورے ہوتے ہیں اس وجہ سے ایلاء اور نکاح و طلاق کے مسائل سے پہلے خود قسم کی اہمیت واضح کرنے کے لیے یہ فرمایا کہ خدا کے نام کو کبھی ایسی قسموں کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے جو نیکی و تقویٰ اور اصلاح کے منافی ہوں۔ خدا کی قسم کھانے کے معنی اس کو گواہ ٹھہرانے کے ہیں، اگر کوئی شخص اس کے نام پر کوئی ایسی قسم کھاتا ہے جو نیکی یا سچائی یا عدل کی مخالفت کے لیے ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ خدا کو خود خدا کے خلاف اور شیطان کے حق میں گواہ بنانا چاہتا ہے۔ اس قسم کی تمام

قسمیں خدا کے ساتھ مذاق کے ہم معنی ہیں اس وجہ سے ایسی قسمیں اول تو جائز ہی نہیں ہیں لیکن اتفاق سے کوئی شخص کھا بیٹھے تو اسلام نے اس کو توڑ دینے کا حکم دیا ہے۔

اخیر میں سمیع اور علیم کے حوالہ میں کچھ دھمکی کا انداز ہے کہ جو لوگ خدا کے قدوس نام کو اس طرح تختۂ مشق ستم بنائیں گے وہ اس حقیقت کو نہ بھولیں کہ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے، وہ ایسے گستاخوں کو سزا دیے بغیر نہ رہے گا۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (۲۲۵)

ارادی اور غیر ارادی قسمیں

یعنی اس مواخذہ سے صرف وہی قسمیں مستثنیٰ ہیں جو بالکل غیر ارادی طور پر زبان پر جاری ہو جاتی ہیں، جن کا تعلق دل سے نہیں بلکہ محض زبان سے ہوتا ہے، جو کسی نفع و نقصان کو پیش نظر رکھ کر نہیں کھائی جاتی ہیں بلکہ محض سخن تکیہ کے طور پر زبان سے اثنائے کلام میں ٹپک پڑا کرتی ہیں۔ لیکن جو قسمیں دل کے قصد و ارادہ اور قلب کے تعمد کا نتیجہ ہوں گی اور جن کا کوئی قریب یا بعید اثر آدمی کے اپنے یا دوسرے کے حقوق و مفادات پر پڑنے والا ہوگا، اگر ان میں خدا کے نام کو غلط طور پر استعمال کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ ان قسموں پر ضرور مواخذہ فرمائے گا۔

"لغو" قسموں کو اگرچہ مواخذہ سے مستثنیٰ رکھا ہے اس لیے کہ خدا غفور اور حلیم ہے لیکن ان کو لغو کے لفظ سے تعبیر کر کے واضح کر دیا کہ ثقہ اور سنجیدہ لوگوں کو ان سے بھی احتراز کرنا واجب ہے۔ قرآن میں شریف و شائستہ لوگوں کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں ان میں یہ بات خاص طور پر بیان ہوئی ہے کہ وہ لغو چیزوں سے احتراز کرتے ہیں۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَاۗءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۲۶) وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۲۷)

ایلاء کے احکام

قسموں کے متعلق مذکورہ بالا تمہید کے بعد اب یہ ایک ایسا مسئلہ شرعی بیان ہو رہا ہے جس میں اصل عامل کی حیثیت قسم کو حاصل ہے۔ یہ مسئلہ ایلا کا ہے۔ "ایلاءٌ" "اَلَا یَالُو" سے باب افعال ہے۔ "اَلَا یَاْلُو" کا اصل لغوی مفہوم کسی امر میں کوتاہی اور کمی کرنا ہے اور "ایلاء" کے معنی کسی چیز کے ترک کی قسم کھا لینے کے ہیں۔ یہ عرب جاہلیت کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم بیوی سے زن و شوہر کا تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا لینا ہے۔ چونکہ اس لفظ میں ترک کا مضمون خود موجود ہے اس وجہ سے قطع تعلق کے معنی کو ادا کرنے کے لیے کسی اور لفظ کی اس کے ساتھ ملانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اس قسم کی قسم چونکہ ازدواجی مقاصد کے خلاف اور برو تقویٰ کے منافی ہے، اس سے بیوی بالکل معلق ہو کے رہ جاتی ہے، اس وجہ سے اسلام نے اس طرح کی قسم کھا بیٹھنے والوں کے لیے چار ماہ کی حد مقرر

کردی ہے کہ اس کے اندر یا تو وہ بیوی سے ازدواجی تعلقات بحال کر لیں یا طلاق دینے کا فیصلہ ہے تو اس کو طلاق دے دیں۔ جو پہلی شکل اختیار کریں گے ان کے متعلق فرمایا کہ اللہ مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ یعنی اگرچہ ان کی یہ قسم ایک حق تلفی پر مبنی تھی اور قسم کو کسی حق تلفی کے لیے سپر بنانا جائز نہیں لیکن اصلاح حال کے بعد اللہ تعالیٰ اس کوتاہی کو معاف کر دے گا۔ یہاں اگرچہ اس قسم کے توڑنے پر کسی کفارہ کا ذکر نہیں ہے لیکن قسموں کے توڑنے کے بارے میں قرآن نے دوسرے مقام میں جو عام ضابطہ بیان فرمایا ہے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ یہ صورت اس سے مستثنیٰ رہے۔ اس وجہ سے ہم ان فقہاء کی رائے کو زیادہ قوی سمجھتے ہیں جو اس صورت میں بھی کفارہ کے قائل ہیں۔

دوسرے گروہ سے متعلق فرمایا کہ اگر انھوں نے طلاق کا فیصلہ کر لیا ہے تو وہ یہ راہ اختیار کر سکتے ہیں لیکن اس معاملے میں اللہ نے جو حدود و قیود مقرر کر دیے ہیں ان کی پوری پوری نگہداشت ملحوظ رہے۔ اللہ ہر چیز کو سنتا اور جانتا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر چار ماہ کی مذکورہ مدت گزر جائے اور اس دوران میں ایک شخص نہ رجوع ہی کرے اور نہ طلاق ہی دے تو کیا ہو گا؟ فقہاء کا ایک گروہ اس سوال کا یہ جواب دیتا ہے کہ چار ماہ کی مدت گزرتے ہی ایک طلاق آپ سے آپ پڑ جائے گی، بعض کے نزدیک یہ ایک طلاق بائن ہو گی اور بعض کے نزدیک رجعی، دوسرے گروہ کے نزدیک چار ماہ کی مدت گزرنے پر معاملہ قاضی کی عدالت میں پیش ہو گا اور وہ شوہر کو حکم دے گا کہ یا تو وہ رجوع کرے یا طلاق دے۔ قرآن کے الفاظ سے جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ چار ماہ گزرنے پر شوہر کو بہر حال یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ یا تو رجوع کرے یا طلاق دے۔ اگر وہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہ کرے تو عورت ایسے شوہر سے بذریعہ عدالت طلاق حاصل کرے گی۔

قرآن کے الفاظ سے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ عورت کو طلاق حاصل کرنے کا یہ حق صرف اس صورت میں حاصل ہو گا جب شوہر نے بربنائے بغض و نفرت بیوی سے نہ ملنے کی قسم کھائی ہو اور پیش نظر اس کو معلق بنا کے رکھنا ہو۔ اگر یہ صورت نہ ہو بلکہ کسی اور وقتی اور عارضی مصلحت، خواہ بتقاضائے صحت یا بارادۂ تنبیہ، کوئی شخص بیوی سے مخصوص ازدواجی تعلق منقطع رکھے تو یہ صورت اس حکم کے تحت نہیں آتی اگرچہ اس انقطاع کی مدت چار ماہ سے متجاوز ہی کیوں نہ ہو جائے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲۲۸)

'قروء' کا مفہوم

"قروء" قرء کی جمع ہے۔ اس کے معنی کی تعیین میں اہل لغت نے اختلاف کیا ہے۔ بعض نے اس کے معنی حیض کے لیے ہیں اور بعض نے طہر کے۔ اس کے اصل مادہ اور اس کے مشتقات پر ہم نے جس قدر غور کیا ہے اس سے ہمارا رجحان اسی بات کی طرف ہے کہ اس کے اصل معنی تو حیض ہی کے ہیں لیکن چونکہ ہر حیض کے ساتھ طہر بھی لازماً لگا ہوا ہے اس وجہ سے عام بول چال میں اس سے طہر کو بھی تعبیر کر دیتے ہیں، جس طرح رات کے لفظ سے اس کے ساتھ لگے ہوئے دن کو یا دن کے لفظ سے اس کے ساتھ لگی ہوئی رات کو۔ اس قسم کے استعمال کی مثالیں ہر زبان میں مل سکتی ہیں۔

یہاں جو مسئلہ بیان ہوا ہے اس کا ظاہری قرینہ بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قروء سے مراد حیض ہی ہے۔ اس لیے کہ آیت میں مطلقہ عورتوں کو جس توقف کی ہدایت ہے اس کی اصل حکمت، جیسا کہ اس آیت سے خود واضح ہے، یہ ہے کہ یہ متعین ہو جائے کہ وہ حاملہ نہیں ہیں۔

ظاہر ہے کہ حاملہ ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ اصلاً حیض ہی سے ہوتا ہے نہ کہ طہر سے۔ اس وجہ سے اس کو حیض ہی کے معنی میں لینا زیادہ اقرب ہے۔ معنی کے اس اختلاف کی وجہ سے زمانہ عدت کے تعین میں حنفیہ اور شافعیہ کے درمیان اختلاف ہوا جو فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

طلاق کی عدت کی حکمت

اصل مقصود اس تین حیض کی مدت سے چونکہ یہ متعین کر لینا ہے کہ عورت حاملہ ہے یا نہیں، اس لیے کہ اس چیز پر بہت سے اہم امور کا انحصار ہے اس وجہ سے ان مطلقات کے ایمان و اسلام کا یہ لازمی تقاضا ٹھہرایا ہے کہ اگر حمل کے قسم کی کوئی چیز وہ محسوس کرتی ہیں تو اس کو چھپانے کی کوشش نہ کریں ورنہ اس سے ان تمام مصالح کو سخت نقصان پہنچے گا جو شریعت نے اس حکم میں عورت اور مرد اور پیٹ میں موجود بچے کے لیے ملحوظ رکھے ہیں۔

اس مدت کے دوران میں شوہر کو حق حاصل ہے کہ وہ اگر سازگاری اور بحالیٔ تعلقات کا طالب ہے تو وہ مراجعت کر سکتا ہے۔ شریعت میں میاں بیوی کے تعلق کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، اس کا ٹوٹنا صرف اسی صورت میں گوارا کیا گیا ہے جب سازگاری کا کوئی امکان بھی باقی نہ رہ گیا ہو۔ اس وجہ سے یہ مدت رکھ دی گئی ہے جس میں دوسرے مصالح کے ساتھ یہ مصلحت بھی ہے کہ اگر طلاق کا باعث کوئی وقتی ناراضگی ہوتی ہے تو فریقین اطمینان کے ساتھ ٹھنڈے دل سے اپنے معاملے پر نظر ثانی کر سکتے ہیں لیکن قرآن نے شوہر کے اس حق مراجعت کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی لگا دی ہے کہ یہ صرف بارادۂ اصلاح یعنی خوشگواری اور محبت کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے ہو، اس سے ہرگز ہرگز عورت کو تنگ کرنا اور ستانا نہ ہو، ورنہ یہ اس حق کا نہایت ظالمانہ استعمال ہوگا جو اللہ کی ناراضگی کا باعث ہے۔

میاں اور بیوی دونوں کے حقوق ہیں

اس کے بعد عورت اور مرد دونوں کے ایک دوسرے پر حقوق کی نہایت جامع الفاظ میں وضاحت فرما دی ہے کہ شوہروں کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ حقوق صرف انہی کے ہیں، بیویوں کا کوئی حق ہی نہیں ہے بلکہ

جس طرح ان پر شوہروں سے متعلق فرائض اور ذمہ داریاں ہیں اسی طرح دستور کے مطابق شوہروں پر ان کے حقوق بھی ہیں، اور یہ فرائض اور یہ حقوق دونوں بالکل متوازن ہیں۔ ہر شوہر کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے حقوق کے مطالبہ کے ساتھ ساتھ بیوی کے حقوق کا بھی لحاظ کرے۔ اسی لحاظ پر میاں بیوی کے سنجوگ اور ان کی ازدواجی زندگی کی خوشگواری کا انحصار ہے۔

گھر کا قوام مرد ہے

البتہ یہ بات ہے کہ خاندانی نظام کے بقا و استحکام کے نقطۂ نظر سے اسلام نے مرد کو عورت پر ایک درجہ ترجیح کا دیا ہے۔ اس ترجیح سے مراد، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات کی تصریحات سے واضح ہے، یہ ہے کہ خاندان کا قوام اور سرپرست اسلام نے عورت کو نہیں بلکہ مرد ہی کو بنایا ہے۔ جس طرح ایک ریاست کا نظم ایک سربراہ کی سربراہی کا محتاج ہے، اسی طرح چھوٹے پیمانہ پر ایک گھر کا نظم بھی ایک قوام کی قوامیت کا محتاج ہے اور اس قوامیت کے لیے اپنی فطرت اور اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے مرد ہی موزوں ہے نہ کہ عورت۔

مرد کے وجوہ ترجیح پر قرآن نے دوسری جگہ دلیل دی ہے اس وجہ سے یہ بحث اپنے مقام ہی پر موزوں رہے گی۔ یہاں جس چیز کی طرف ہم توجہ دلانا چاہتے ہیں وہ قرآن کے یہ الفاظ ہیں کہ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ اس کے معنی ظاہر ہیں کہ یہی ہو سکتے ہیں کہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ ترجیح حاصل ہے۔ قرآن کے ان واضح الفاظ کی موجودگی میں ایک مسلمان کے لیے مساواتِ مرد و زن کے اس نظریے پر ایمان لانے کی تو کوئی گنجائش نظر نہیں آتی جو ہمارے ہاں مغرب سے درآمد ہوا ہے۔ قرآن اس امر کو تو تسلیم کرتا ہے کہ عورت پر جس درجے کی ذمہ داریاں ہیں، اسی کے ہم وزن اس کے حقوق بھی ہیں لیکن وہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ عورت اور مرد دونوں ہر اعتبار سے بالکل برابر ہیں بلکہ صاف الفاظ میں مرد کو عورت پر ایک درجہ ترجیح دیتا ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہ جو فرمایا ہے کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ تو اس کے معنی بھی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ عورت اور مرد دونوں کے حقوق برابر ہیں بلکہ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ عورت پر جس طرح ذمہ داریاں ہیں، اسی طرح اس کے حقوق بھی ہیں۔

قرآن نے اسی لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ کے اصول کو بنیاد قرار دے کر خاندان میں قوامیت اور سربراہی کا مقام، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، مرد کو دیا ہے اور پھر اسی پر اس نے تمام عائلی قوانین و احکام کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر اس بنیاد کو ڈھا کر مغربی نظریۂ مساوات کی اساس پر، جو ہر اعتبار سے عورت و مرد دونوں کو ایک ہی درجہ میں رکھنے کا مدعی ہے، اسلام کے عائلی قوانین کو سمجھنے اور ڈھالنے کی کوشش کی جائے تو اس کوشش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا کہ پورا دین محرف ہو کر رہ جائے۔

عزیز و حکیم کی وضاحت

آیت کے آخر میں خدا کی دو صفتوں — عزیز اور حکیم — کا حوالہ ہے۔ خدا عزیز ہے اس وجہ سے اسی

ملہ جو لوگ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کے طالب ہوں، وہ ہماری کتاب 'اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام' پڑھیں۔ اس میں ہم نے اس مسئلہ کے ہر پہلو پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، قرآن اور فلسفہ جدید دونوں کی روشنی میں۔

کو حق ہے کہ وہ حکم دے اور وہ حکیم ہے اس وجہ سے جو حکم بھی اس نے دیا ہے وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے، بندوں کا کام یہ ہے کہ اس کے احکام کی بے چون وچرا اطاعت کریں۔ اگر وہ اس کے احکام کی مخالفت کریں گے تو اس کی غیرت و عزت کو چیلنج کریں گے اور اس کے عذاب کو دعوت دیں گے اور اگر خدا سے زیادہ حکیم اور مصلحت شناس ہونے کے خبط میں مبتلا ہوں گے تو خود اپنے ہاتھوں اپنے قانون اور نظام سب کا تیا پانچا کر کے رکھ دیں گے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاکٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ یَّخَافَاۤ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۲۹)

طلاق کا صحیح طریقہ

اب یہ طلاق کا صحیح طریقہ بتا دیا کہ تمام معاشرتی زندگی کی بنیاد چونکہ نکاح کے پاکیزہ رشتے ہی پر ہے اس وجہ سے اگر کسی مجبوری کے باعث اس کے ٹوٹنے کی نوبت آئے تو یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ آدمی ایک ہی جھٹکے میں اس مقدس رشتے کو توڑ تاڑ کے رکھ دے بلکہ مطلقہ کے لیے جس طرح یہ ہدایت ہے کہ وہ تین حیض تک انتظار کرے اسی طرح طلاق دینے والے کے لیے یہ ہدایت ہے کہ وہ الگ الگ طہروں میں دو مرتبہ میں طلاق دے اور پھر تیسرے طہر میں یا تو بیوی سے مراجعت کرے اگر مراجعت کرنا چاہے یا اس کو رخصت کر دے اگر اس کا آخری فیصلہ اس کو رخصت کر دینے ہی کا ہے۔ مراجعت کی شکل میں اس کو معروف کی پابندی کی ہدایت کی گئی یعنی اس مراجعت سے مقصود بیوی کو اس طریقہ سے بیوی بنا کر رکھنا ہو جس طرح ایک شریف، مہذب اور خدا ترس آدمی بیوی کو رکھتا ہے اور جس کا بھلے لوگوں میں چلن ہے، مقصود اس سے بیوی کو معلق رکھنا اور دکھ دینا نہ ہو۔ رخصت کرنے کی شکل میں اس کو احسان کی ہدایت ہوئی کہ ہر چند اب اس کا بیوی کی حیثیت سے کوئی حق باقی نہ رہا لیکن مرد کی مردانگی اور فتوت کی شان یہی ہے کہ جس کے ساتھ مہر و محبت کے روابط رہ چکے ہوں اور جو ایک صنف ضعیف بھی ہے اس کو حسب توفیق دے دلا کر خوب صورتی کے ساتھ رخصت کرے۔

مطلقہ کے لیے تین حیض تک توقف میں جس طرح بہت سی مصلحتیں ہیں اسی طرح طلاق دینے والوں کے لیے مذکورہ ترتیب کے ساتھ طلاق دینے میں بہت سی برکتیں ہیں جن سے وہ لوگ محروم ہو جاتے ہیں جو غصہ اور جوش کی حالت میں شریعت کی اس ہدایت کی پیروی نہیں کرتے اور ایک ہی سانس میں تین یا اس سے زیادہ طلاقیں دے ڈالتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ عموماً اپنے کیے پر زندگی بھر پچھتاتے ہیں لیکن ان کا یہ پچھتانا بالکل بے سود ہوتا ہے۔ شریعت نے یہ طریقہ اسی لیے بتایا ہے کہ ازدواجی رشتہ ایک نہایت اہم رشتہ ہے، اس کا ٹوٹنا نہیں بلکہ تا حدِ امکان اس کا جڑا رہنا مطلوب ہے، اس وجہ سے اس کے متعلق کوئی فیصلہ غصہ یا عجلت میں نہیں ہونا چاہیئے بلکہ سوچ سمجھ کر ٹھنڈے دل سے ہونا چاہیئے، اور یہ اسی صورت

ہیں ممکن ہے جب مذکورہ ہدایت پر عمل کیا جائے[1]۔

مرد کی فتوت کا حق

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا (اور تمھارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ تم نے ان کو جو کچھ دیا دلایا ہو وہ ان سے واپس لو) سے ظاہر ہے کہ نان نفقہ اور مہر وغیرہ کی قسم کی چیزیں مراد نہیں ہو سکتیں اس لیے کہ یہ چیزیں تو عورت کا حق ہیں، ان کو واپس لینے یا کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اس وجہ سے اس سے لازماً وہ چیزیں مراد ہیں جو بطور تحفہ وغیرہ دی گئی ہوں۔ ان چیزوں کے بارے میں فرمایا کہ طلاق ہو جانے کے بعد مرد کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ ان کا حساب کتاب کرنے بیٹھ جائے۔ اس ممانعت کی وجہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، یہ ہے کہ اس قسم کی خست اس فتوت اور بلند حوصلگی کے منافی ہے جو ایک مرد میں ہونی چاہیے۔ چنانچہ عورتوں کے معاملے میں قرآن نے مردوں کو اس فتوت کی طرف ایک سے زیادہ مقامات میں توجہ دلائی ہے، خاص طور پر تعلقات کے منقطع ہو جانے کی صورت میں، مثلاً وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ ۱۹ - نساء (اور ان کو اس مقصد سے تنگ کرنے کی کوشش نہ کرو کہ جو کچھ تم نے ان کو دیا تھا اس کو واپس لے سکو) دوسری جگہ ہے وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۲۱ - نساء (اور تم ان سے کس طرح لوگے جب کہ تم ایک دوسرے کی طرف محبت سے بڑھ چکے ہو اور وہ تم سے نہایت مضبوط عہد لے چکی ہیں) اور اسی بقرہ میں آگے مردوں کو خطاب کر کے یہ آیت آ رہی ہے وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۲۳۷ - بقرۃ (اور یہ کہ عورت کی طرف سے معافی کے خواہشمند ہونے کے بجائے تم اپنا حق چھوڑ دو، یہ زیادہ تقویٰ سے قریب ہے اور تم میں سے ایک کو دوسرے پر جو ترجیح حاصل ہے اس کو نہ بھولو)

خلع کے احکام

اس کے بعد وہ شکل بیان ہوئی ہے جو اس ممانعت سے مستثنیٰ ہے۔ یہ وہ شکل ہے جب کہ بیوی کو بھی میاں سے ایسا اختلاف ہو کہ صاف نظر آ رہا ہو کہ ازدواجی زندگی کے نباہ کے لیے جن حدود و قیود کی نگہداشت ضروری ہے ان کو فریقین ملحوظ نہیں رکھ سکتے تو اس امر میں کوئی حرج نہیں ہے کہ بیوی کوئی مال یا رقم فدیہ کے طور پر دے کر ایسے میاں سے چھٹکارا حاصل کر لے۔ شریعت کی اصطلاح میں اس کو خلع کہتے ہیں۔ اس صورت میں چونکہ غالب مصلحت عورت کی ہوتی ہے اس وجہ سے کمزور عنصر ہونے کے باوجود اس معاوضہ کو لینے کی اجازت دی گئی۔

قرآن کے الفاظ سے اس خلع کے متعلق دو باتیں نمایاں ہوتی ہیں۔

۱۔ ایک تو یہ کہ اگر میاں بیوی آپس میں کوئی بات طے نہ کر سکیں تو عورت لازماً یہ معاملہ عدالت میں لے

---

[1] یہ ملحوظ رہے کہ ہم اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ اگر کوئی شخص اس ہدایت کے خلاف طلاق دے تو وہ طلاق واقع ہی نہیں ہوگی۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث ہم نے اپنی کتاب "عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ" میں کی ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

جاسکتی ہے اور عدالت خلع اور معاوضہ دونوں کا فیصلہ کرے گی۔ اس کا ثبوت فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ (پس اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ میاں بیوی اللہ کے حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو.....) سے ملتا ہے۔ اس میں خِفْتُمْ کا خطاب ظاہر ہے کہ اسلامی معاشرہ سے بحیثیت مجموعی ہے اور معاملات و نزاعات میں معاشرے کی مداخلت عدالت ہی کے واسطے سے ممکن ہے۔

۲۔ دوسری یہ کہ خلع یا فسخ نکاح کے مطالبہ کا حق عورت کو اسی صورت میں ہے جب یہ ثابت ہو سکے کہ ازدواجی زندگی میں جن حدود اللہ کا قیام مطلوب ہے مرد ان کو قائم رکھنے کے قابل نہیں یا ان کو قائم نہیں رکھنا چاہتا اور عورت کے لیے ان کے قیام کے بغیر حدود اللہ پر قائم رہنا ناممکن یا دشوار ہے۔ اس کا ثبوت اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ سے ملتا ہے۔ اگر اختلاف محض ذوقی اور سطحی نوعیت کا ہے جس کو انگیز کیا جا سکتا ہے تو ایسی صورت میں عورت کو خلع یا فسخ نکاح کا مطالبہ لے کر نہیں اٹھنا چاہیے۔ اگر چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی عورت کو یہ حق استعمال کرنے کی راہ کھول دی جائے تو اس سے خاندانی نظام کی چولیں ہل جائیں گی درآنحالیکہ خاندان کے اس نظام ہی کو اسلام میں سیاسی نظام کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ معاملے کی اسی اہمیت کی وجہ سے خلع یا فسخ نکاح کے مطالبے کی شکل میں عدالت یہ دیکھے گی کہ کیا فی الواقع صورت معاملہ ایسی ہے کہ فریقین کے لیے نباہ ناممکن یا دشوار ہے یا محض کندھا بدلنے اور ذائقہ تبدیل کرنے کی خواہش ہے جس کے تحت عورت نے مرد کو عدالت میں کھینچ بلایا ہے۔

"تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ الاٰية" یہ ان تمام احکام و ہدایات سے متعلق ہے جو آیت (۲۲۲) سے لے کر یہاں تک بیان ہوئے ہیں۔ فرمایا کہ یہ تمھاری ازدواجی زندگی سے متعلق خدا کی حدبندیاں ہیں، جس طرح تم اپنے رقبوں اور اپنی چراگاہوں کے اردگرد حدبندیاں کرتے ہو اور یہ نہیں چاہتے کہ کوئی ان حدوں کو توڑے اور اگر کوئی ان حدود میں مداخلت کرتا ہے تو تم اس کو اپنی ملکیت میں مداخلت اور اپنی عزت و غیرت کے لیے ایک چیلنج سمجھتے ہو اسی طرح خدا نے بھی اپنے محارم کے اردگرد یہ حدیں قائم کر دی ہیں، تم ان سے باہر آزاد ہو لیکن ان کے اندر تمھیں مداخلت کی اجازت نہیں ہے، اگر کسی نے ان حدوں کو توڑنے یا لانگنے کی جسارت کی تو وہ یاد رکھیں کہ وہی لوگ ظالم ہیں۔ یعنی اس کے نتیجے میں جو کچھ اس دنیا میں یا آخرت میں ان کے سامنے آئے گا اس کی ساری ذمہ داری خود انھیں پر ہے، خدا پر نہیں ہے اور اس سے وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھائیں گے خدا کا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ خدا کے قوانین تمام تر فطرت انسانی کے تقاضوں اور بندوں کے اپنے مصالح پر مبنی ہیں اسی وجہ سے جو لوگ ان کو توڑتے ہیں وہ اپنی ہی فطرت اور اپنے ہی مصالح کی دھجیاں خود اپنے ہی ہاتھوں بکھیرتے ہیں۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا

يَّعْلَمُوْنَ (۲۳۰)

ایک پُرحکمت پابندی

آخری طلاق دے چکنے کے بعد اگر کوئی شخص پھر اس عورت سے نکاح کرنا چاہے تو یہ اس کا حکم بیان ہو رہا ہے کہ جب تک وہ عورت کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے اور وہ اس کو طلاق نہ دے اس وقت تک یہ عورت اپنے پہلے شوہر کے لیے جائز نہیں ہو سکتی۔ جس طرح اوپر والا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ طلاق کا فیصلہ غصہ یا عجلت میں نہ کیا جائے اسی طرح اس پابندی سے مقصود طلاق کو ایک سہل کھیل بنانے سے بچانا ہے۔ اگر طلاق کے بعد بھی طلاق دینے والے کے لیے اس عورت سے نکاح کی آزادی باقی رہتی تو بہت سے لوگ طلاق کی حقیقی اہمیت نہ سمجھ سکتے لیکن جب یہ پابندی لگ گئی کہ چھوڑی ہوئی بیوی دوبارہ اسی صورت میں مل سکتی ہے جب وہ کسی اور کی بیوی بنے اور وہ کسی سبب سے چھوڑے اور عورت اس سے نکاح پر راضی ہو تو گویا بیچ میں ایک پورا ہفتخواں حائل ہو گیا، ظاہر ہے کہ اب اس پابندی کے سامنے آجانے کے بعد جو طلاق دے گا وہ سو بار سوچ کر طلاق دے گا اور اسلام کا منشا یہی ہے کہ جو بھی طلاق دے وہ خوب سوچ سمجھ کر طلاق دے، دور تک سارے نتائج کو سامنے رکھ کر۔

لفظ 'نکاح' عقدِ نکاح کے مفہوم میں

"حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ" میں نکاح کا لفظ ہمارے نزدیک عقد نکاح ہی کے معنی میں ہے۔ جن لوگوں نے اس کو وطی کے معنی میں لیا ہے انھوں نے ایک غیر ضروری سا تکلف کیا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ معنی لینے سے بھی وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جو وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، یہاں اس لفظ کا طریق استعمال اس معنی سے ابا کر رہا ہے۔ یہاں تَنْکِحَ کا فاعل ظاہر ہے کہ عورت ہے، اگر اس کے معنی وطی کے لیے جائیں تو اس کا ترجمہ ہو گا کہ "یہاں تک کہ وہ عورت کسی دوسرے شوہر سے وطی کرے"۔ وطی کرنا مرد کا کام ہے نہ کہ عورت کا۔ اور اگر یہ ترجمہ کریں کہ "یہاں تک کہ وہ کسی اور شوہر سے وطی کرائے" تو اس نادر معنی کے لیے ثبوت کہاں سے لائیں گے ؟

نکاح کا اصل مقصد

اصل یہ ہے کہ لفظ نکاح شریعت اسلامی کی ایک معروف اصطلاح ہے جس کا اطلاق ایک عورت اور مرد کے اس ازدواجی معاہدہ پر ہوتا ہے جو زندگی بھر کے نباہ کے ارادے کے ساتھ زن و شوکی زندگی گزارنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اگر یہ ارادہ کسی نکاح کے اندر نہیں پایا جاتا تو وہ فی الحقیقت نکاح ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک سازش ہے جو ایک عورت اور ایک مرد نے باہم مل کر کر لی ہے۔ نکاح کے ساتھ شریعت نے طلاق کی جو گنجائش رکھی ہے تو وہ اصل اسکیم کا کوئی جزو نہیں ہے بلکہ یہ کسی ناگہانی افتاد کے پیش آجانے کا ایک مجبورانہ مداوا ہے۔ اس وجہ سے نکاح کی اصل فطرت یہی ہے کہ وہ زندگی بھر کے سنجوگ کے ارادے کے ساتھ عمل میں آئے۔ اگر کوئی نکاح واضح طور پر محض ایک معین و مخصوص مدت تک ہی کے لیے ہو تو اس کو متعہ کہتے ہیں اور متعہ اسلام میں قطعی حرام ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اس نیت سے کسی عورت سے نکاح کرے کہ اس نکاح کے بعد طلاق دے کر وہ اس عورت کو اس کے پہلے شوہر کے لیے

جائز ہونے کا حیلہ فراہم کرے تو شریعت کی اصطلاح میں یہ حلالہ ہے اور یہ بھی اسلام میں متعہ ہی کی طرح حرام ہے۔ جو شخص کسی کی مقصد برآری کے لیے یہ ذلیل کام کرتا ہے وہ درحقیقت ایک قرم ساق یا بھڑوے یا جیسا کہ حدیث میں وارد ہے "کرایہ کے سانڈ" کا رول ادا کرتا ہے اور ایسا کہنے والے اور ایسا کروانے والے پر اللہ کی لعنت ہے۔

'متعہ' اور 'حلالہ' میں فرق

البتہ متعہ اور حلالہ میں اس اشتراک کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا فرق بھی ہے۔ وہ یہ کہ متعہ صریح طور پر ایک متعین مدت کے لیے ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے متعلق واضح طور پر ایک فقیہ یہ حکم لگا سکتا ہے کہ یہ نکاح منعقد نہیں ہوا لیکن حلالہ کی نوعیت ایک درپردہ سازش کی ہوتی ہے، اس کے متعلق کوئی ظاہری ثبوت اس بات کا موجود نہیں ہوتا کہ نکاح کے نام سے یہ اللہ کی شریعت کے ساتھ مذاق کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے اللہ کے نزدیک تو یہ نکاح اور یہ طلاق سب باطل ہوگا لیکن ایک فقیہ جو صرف ظاہر حالات کو سامنے رکھ کر فتویٰ دینے پر مجبور ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس طرح کا نکاح سرے سے منعقد ہی نہیں ہوا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر بعض فقہا اس کے انعقاد کو مانتے ہیں اور مجھے ان کی یہ بات قوی معلوم ہوتی ہے۔

ایک بے دلیل بات

رہی یہ بات کہ ایسی عورت اپنے پہلے شوہر کے لیے صرف اس صورت میں جائز ہوگی جب اس کا دوسرا شوہر اس کو وطی کے بعد طلاق دے تو کم از کم اس وطی کے لیے قرآن سے کوئی ثبوت نہیں نکلتا۔ تَنْكِحَ کے لفظ سے جو دلیل دی جاتی ہے اس کا بے بنیاد ہونا، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، بالکل واضح ہے، پھر دیکھنے کی چیز یہ بھی ہے کہ فعل وطی کے واقع ہو جانے سے حلالہ کی سنگینی اور اس کی ملعونیت میں کیا کمی ہو جائے گی؟ اگر ایک نکاح حلالہ کی سازش کے تحت ہوا ہے تو اس بات سے اس کی نوعیت میں کیا فرق پیدا ہوتا ہے کہ طلاق قبل از وطی دی گئی یا بعد از وطی؟ اگر بغیر وطی کے دی گئی تو یہ بھڑواپن ہے اور اگر وطی کے بعد دی گئی تو ایسے شخص کو حدیث کے الفاظ میں تَيس مستعار یعنی کرائے کا سانڈ سمجھیے، بہر حال دونوں ہی صورتوں میں یہ نکاح و طلاق کا ڈرامہ شریعت الٰہی کے ساتھ ایک مذاق ہوا۔ اس آیت میں ہمیں جو تعلیم دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ عورت فی الواقع زندگی بھر کے نباہ کے ارادہ کے ساتھ کسی دوسرے شوہر کے حبالۂ عقد میں داخل ہو اور یہ دوسرا شوہر اسی طرح کی کسی مجبوری کے تحت اس کو طلاق دے جس طرح کی مجبوریوں میں کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے۔ اگر یہ صورت ہوگی تو بلا شبہ یہ عورت اپنے پہلے شوہر کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے، لیکن اگر اس نکاح و طلاق میں کسی سازش کو دخل ہے تو یہ نکاح و طلاق اور اس کے سارے شرکا عند اللہ ملعون و مغضوب ہیں، اس سے کچھ بحث نہیں کہ یہ سب کچھ وطی کے بعد ہوا ہے یا وطی کے بغیر۔

یہ مسئلہ درحقیقت پیدا ایک حدیث کی بنا پر ہوا ہے، قرآن سے اس کے لیے استدلال تو محض ایک نکتہ بعد الوقوع ہے، لیکن ہمارے نزدیک حدیث سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ بھی نہایت کمزور ہے۔

حدیث کے مختلف طریقوں کو جمع کر کے جو نتیجہ سامنے آتا ہے ہم نے دیکھا ہے کہ وہ قرآن کے بالکل موافق ہے۔ اگر ہم نے اپنی اس کتاب میں فقہی مباحث کے لیے ایک خاص حد نہ مقرر کر لی ہوتی تو ہم اس حدیث پر بھی تفصیل کے ساتھ بحث کر کے دکھاتے کہ اصل حقیقت کیا بیان ہوئی ہے اور لوگوں نے اس کو کیا بنا دیا ہے لیکن یہ بحث ہمارے دائرہ سے باہر ہے۔

آگے فرمایا کہ دوسرے شوہر سے طلاق مل جانے کے بعد اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ دونوں سابق میاں بیوی آپس میں پھر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں بشرطیکہ یہ توقع رکھتے ہوں کہ وہ اللہ کے حدود کو قائم رکھ سکیں گے۔ اس تنبیہ کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ نکاح و طلاق بہر حال بچوں کا کھیل نہیں ہے، یہ جب بھی عمل میں آئے، سچے ارادے اور سازگاری کی مخلصانہ خواہشوں کے ساتھ ہی عمل میں آئے۔

فعل ارادۂ فعل کے مفہوم میں

آخر میں فرمایا کہ اللہ نے اپنی مقرر کی ہوئی حدوں کو اچھی طرح لوگوں کے لیے واضح کر دیا ہے کہ جو لوگ حدود الٰہی کے علم کے طالب ہیں ان کی قدر کریں اور ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے بچیں۔ یَعْلَمُوْنَ کا ترجمہ ہم نے "جو لوگ علم کے طالب ہیں" کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی میں فعل کے استعمالات کے مواقع پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فعل جس طرح اپنے ظاہری یا ابتدائی معنی کے لیے آتا ہے یا جس طرح اپنے کامل اور حقیقی معنی کے لیے آتا ہے اسی طرح ارادۂ فعل اور طلبِ فعل کے لیے بھی آتا ہے اور امتیاز ان کے درمیان موقع کلام اور سیاق و سباق سے ہوتا ہے۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۲۳۱)

شریعت الٰہی سے مذاق کا انجام

ایک مطلقہ کے لیے انتظار کی جو مدت شریعت نے مقرر کی ہے وہ آیت ۲۲۸ میں بتا دی گئی ہے اور آیت ۲۲۹ میں طلاق کا صحیح طریقہ بھی بتا دیا گیا ہے اور یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ تیسرے طہر میں یا تو دستور کے مطابق بیوی سے ازدواجی تعلقات بحال کر لو اور اگر یہ منظور نہ ہو تو پھر حسن و خوبی کے ساتھ اس کو رخصت کر دو۔ اب اس آیت میں اس امر کی مزید وضاحت فرما دی کہ "دستور کے مطابق روکنے" سے شریعت کا کیا منشا ہے؟ اس منشا کی وضاحت یوں فرمائی کہ یہ روکنا ہرگز ہرگز اس ارادے کے ساتھ نہ ہو کہ اس طرح بیوی تمہارے پنجۂ ستم میں اسیر رہے اور تم اس کو اپنی خواہش کے مطابق اذیت پہنچا سکو۔ مثبت پہلو سے بات اور پر کہہ چکنے کے بعد منفی پہلو سے بھی اس کی وضاحت اس لیے کر دی گئی کہ ظالم لوگ طلاق اور طلاق کے بعد مراجعت کے شوہری حق کو اس ظلم کے لیے استعمال کر سکتے تھے حالانکہ یہ صریح اعتداء یعنی اللہ کے حدود سے تجاوز اور اس کی شریعت کو مذاق بنانا ہے۔ فرمایا کہ جو ایسی جسارت کرتے ہیں بظاہر تو وہ ایک عورت کو نشانۂ ظلم

بناتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ سب سے بڑا ظلم اپنی جان پر کرتے ہیں کیونکہ اللہ کے حدود کو پھاندنے اور اس کی شریعت کو مذاق بنانے کی سزا بڑی ہی سخت ہے۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو کہ اس نے تمھیں ایک برگزیدہ امت کے منصب پر سرفراز فرمایا، تمھاری ہدایت کے لیے تمھارے اندر اپنا نبی بھیجا، تمھیں خیر و شر اور نیک و بد سے آگاہ کرنے کے لیے تمھارے اوپر اپنی کتاب اتاری جو قانون اور حکمت دونوں کا مجموعہ ہے۔ اللہ کی ایسی عظیم نعمتیں پانے کے بعد اگر تم نے ان کا یہی حق ادا کیا کہ خدا کے حدود کو توڑا اور اس کی شریعت کو مذاق بنایا تو سوچ لو کہ ایسے لوگوں کا انجام کیا ہو سکتا ہے! پھر فرمایا کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان رکھو کہ وہ تمھاری ہر بات سے باخبر ہے، یعنی وہ لوگوں کی شرارتوں کے باوجود ان کو ڈھیل تو دیتا ہے لیکن جب وہ پکڑے گا تو اس کی پکڑ سے کوئی بھی چھوٹ نہ سکے گا۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ شریعت کو مذاق بنانے سے صرف یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا کھلم کھلا مذاق اڑایا جائے بلکہ اس کی ایک نہایت سنگین شکل یہ بھی ہے کہ ظاہری اعتبار سے تو کام ایسا کیا جائے کہ اس پر کوئی اعتراض نہ کیا جا سکے لیکن مقصد و منشا کے لحاظ سے وہ کام شریعت کے مقصد کے بالکل خلاف ہو، مثلاً تیسرے طہر میں اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے مراجعت کرے تو از روئے شریعت اس کو اس کا حق تو حاصل ہے لیکن اگر اس سے اس کا مقصد بیوی کو تنگ کرنا ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے اللہ کی آیات کے پردے میں اللہ ہی کی مخالفت کی، ظاہر ہے کہ یہ اللہ اور اس کی شریعت کے ساتھ صریح مذاق ہے۔

۴۷۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۲۳۲-۲۳۷

نکاح و طلاق سے متعلق جو مضمون اوپر بیان ہوا اسی سلسلے کی مزید ہدایات آگے بیان ہو رہی ہیں۔

آیات ۲۳۲-۲۳۷

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ۗ ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٢﴾ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ۖ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۚ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَ

كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَارَّ
وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُ بِوَلَدِهِ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ
مِثْلُ ذَٰلِكَ ۗ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَن تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ وَإِنْ أَرَدتُّمْ أَن تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُم مَّا آتَيْتُم بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا
أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٣﴾ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَ
يَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۖ
فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي
أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٢٣٤﴾ وَلَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي
أَنفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ
سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ
حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي
أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٢٣٥﴾ لَّا
جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ
تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ
وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٣٦﴾
وَإِن طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ

ع ٣٠ ١٤